UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226462

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ١٩٢٥٣ Accession No. ١٤٣٠٥

Author ک س عبدالقدوس ہاشمی

Title تقویم دولت

This book should be returned on or before the date last marked below.

ہماری جدید مطبوعات

محمد علی۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی زندگی کے مکمل حالات ہندوستان کے جادو قلم سیرت نگار مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیئے۔ قیمت (عمہ/۱۲)

مضامین عبدالماجد دریابادی۔ مولانا موصوف کے اُن ادبی جواہر پاروں کا مجموعہ جس کا مُدت سے انتظار تھا۔ یہ مجموعہ آپ کو ضخیم ضخیم کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کردے گا۔ قیمت (اعہ/)

محسوسات ماہر۔ شاعرِ حیات مولانا ماہر القادری کا پہلا مجموعہ کلام جس کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہوا تھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ قیمت صرف دو روپیہ بارہ آنہ (عہ/۱۲) مجلد

نغمات ماہر۔ شاعرِ حیات ماہر القادری کا دوسرا مجموعۂ کلام رومانیت و واقعیت کا دل نواز مرکب، انسانی ذہن و رُوح کے لئے فکر و نشاط کا جدید پیمانہ نئے تصورات کی موثر نمایندگی۔ قیمت صرف تین روپیہ

رنگ محل۔ ساغر نظامی کی نظموں، غزلوں، اور گیتوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔

ملنے کے پتے:
- ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن
- سیّد عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

یقین وعمل

مشہور برطانوی فلسفی و مدبر وائیکونٹ سموئیل کی شہرہ آفاق کتاب

Belief and Action "بلیف اینڈ ایکشن"

اردو زبان میں

از

عبدالقدوس ہاشمی

ناشر

ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

قیمت
دو روپیہ چار آنہ

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس

گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشرز

حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

نمبر سلسلہ		مضامین	نمبر صفحہ
۱	پہلا باب۔	دورِ انتشار	۱۰
۲	دوسرا باب۔	عالم محسوسات	۱۶
۳	تیسرا باب۔	معلوماتِ سائنس	۲۶
۴	چوتھا باب۔	قدیم عقاید اور جدید علوم	۳۴
۵	پانچواں باب۔	وجدان، علم باطن اور کرامات	۴۲
۶	چھٹا باب۔	مذہب کی معقولیت	۵۸
۷	ساتواں باب۔	شر اور مصائب	۷۲
۸	آٹھواں باب۔	درست نادرست	۹۲
۹	نواں باب۔	عمل صالح کے محرکات	۱۱۲
۱۰	دسواں باب۔	عائلی زندگی	۱۳۲
۱۱	گیارھواں باب۔	افلاس و تونگری	۱۴۶
۱۲	بارھواں باب۔	آزادی	۱۷۴
۱۳	تیرھواں باب۔	قومیت اور انسانیت	۱۹۲
۱۴	چودھواں باب۔	شرائط امن	۱۹۸
۱۵	پندرھواں باب۔	عمل	۲۰۴

تعارف

کچھ دن ہوئے کہ مجھے **Belief and Action**
نام کی ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کے مولف برطانوی جمعیتہ فلاسفہ کے صدر اور حکومت برطانیہ کے سابق وزیر وائیکونٹ سموئیل ہیں۔ میں نے کتاب کو شروع سے اخیر تک بغور مطالعہ کیا۔ کتاب دلچسپ اور اپنے موضوع پر یکتا کتاب ہے۔ پھر اپنے فاضل مصنف کی شخصیت کے اعتبار سے بھی خود اہمیت کی مستحق ہے۔ خیال ہوا کہ اسے اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ اب اس ارادہ سے جو کتاب پر نظر ڈالی تو بعض حصے غیر ضروری اور ضرورت سے زیادہ طویل نظر آئے۔ کہیں کہیں مجھے اختلاف بھی تھا، اس لیے حواشی کا اضافہ کیا گیا۔ غرض یہ کہ ترجمہ تو اسے کہنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اردو تحریر میں اصل کتاب کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ کہیں تلخیص ہے کہیں تبدیل، اور اکثر مقامات پر توحسب ضرورت کم و بیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر جہاں فاضل مؤلف کے بیان سے خیالات پر بُرے اثر مرتب ہونے کا اندیشہ تھا وہاں طویل حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے بہر حال یہ کتاب اب جس صورت میں آپ کے سامنے پیش ہے وہ تالیف ہے

اور نہ ترجمہ لیکن ایک کتاب ہے جس میں فاضل وائیکونٹ کے خیالات مع حواشی و اضافہ موجود ہیں۔

فاضل مصنف کی شخصیت سے متعلق اس تعارف کے اخیر میں ایک صفحہ کا مختصر نوٹ موجود ہے اس سے آپ اس جلیل القدر عالم کو اچھی طرح پہچان سکیں گے۔

کتاب کے متعلق عرض ہے کہ مصنف نے انسانی فکر اور انسانی عمل پر اثر انداز ہونے والے مسائل کی اس کتاب میں اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ اور بعض یوروپی تبصرہ نگاروں کے خیال کے بموجب "فلسفہ اس کتاب میں سب سے پہلی مرتبہ تخیل کے آسمان سے عمل کی زمین پر نازل ہوا ہے"۔ اور یہی خیال تھا جو اردو میں اس کتاب کے منتقل کئے جانے کا حقیقی محرک ثابت ہوا۔

میرے ذاتی خیالات اس کتاب کے متعلق یہ ہیں کہ مصنف نے مخلصانہ جذبات کے ساتھ دنیا کی اصلاح کا ایک نقشہ بنایا ہے، اور فلسفیانہ انداز بیان میں اس کی تشریح بھی کی ہے، ساری کتاب بڑے بڑے یوروپین مفکرین اور علماء مثلاً ریچرڈ برٹن، جین، بری وغیرہ کے خیالات اور افکار سے ماخوذ ہے مصنف کی قلم کاری نے ان خیالات وافکار میں گل بوٹے پیدا کئے ہیں۔ اور خوشنما پیدا کئے ہیں، ان کی محنت قابل داد اور ان کی فکر قابل تحسین لیکن اتنے ذمہ دار سرکاری عہدہ دار کے خیالات اور افکار پر

جو قومی تصور طاری ہوا کرتا ہے۔ اس سے فاضل مصنف بھی آزاد نہیں پایا
جہاں برطانوی طرز عمل اور اہل برطانیہ کی مساعی کو نمونہ میں پیش کرتے ہیں
بے اختیار شبدیز قلم فراٹے بھرتا ہے۔

اصولِ مذہب کا مطالعہ ہمارے مصنف نے اس طرح کیا ہے
کہ یورپ کا کلیسائی نظام ہمہ دم ان کے سامنے رہا ہے، اور عیسائیت کی
سادہ تعلیم نہیں بلکہ سولھویں اور سترھویں صدی کی مرکب و مخلوط عیسائیت
سے الگ ہو کر کچھ بھی نہیں دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذہب کی
کسی حد تک حمایت کرنے کے باوجود وہ مذہب کی ضرورت پر قوی
دلائل کے پیش کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔

اجتماعی مسائل پر جہاں بحث کی گئی ہے وہاں مصنف کے
نزدیک ملکی رواج اور قومی روایات کو بڑا مرتبہ دیا گیا ہے۔ بسر و چشم قبول
لیکن اُس کے مبنی بر صداقت ہونے کی کیا دلیل ہے؟ مذہب کو
اجتماع سے باہر کر کے کیوں غور کیا جائے؟ اگر افراد انسانی کے اعمال
ان کے قلبی یقین کے ماتحت ہوتے ہیں اور مذہب بقول مصنف ایک
قوی و موثر محرک ہے تو اجتماعی اعمال پر اس کا اثر کیوں نہ پڑے گا۔
اور کیوں نہ اس انتہائی قوی محرک سے کام لیا جائے؟ جب کہ خود
مصنف کو بھی یقین ہے کہ مذہب انسانی روح کو سکینت اور خود
فاعل کو اپنے فعل کا محتسب بنا دیتا ہے۔ اگر اس دنیا کو چین و

سکون کی دنیا بنانا ہے۔ اور انسانی اعمال کو ایک مفید اور مکمل نظام کے ماتحت اجتماع انسانی کے لیے، خانوادہ میں، ملک میں، اور ساری دنیا میں منظم و مفید قواعد کا پابند کرنا ہے تو حسب خیال مصنف کیوں نہ ایک ایسے مکمل مذہب کی تلاش کی جائے ۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک ایسا مذہب موجود ہے۔ نام سے نفرت ایک ضد ہے ورنہ تنقید و تنقیح کے ساتھ اس کے اصول کو قبول کرلینا مشکل نہیں ہے ۔

کتاب کے آخری باب میں عملیت پر جو اصرار کیا گیا ہے اُس سے اتفاق نہ کرنا تصور پرستی ہے ۔ اور کم از کم اپنی ذات سے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ابتدائی زندگی سے اب تک اقبالؒ کے اس شعر پر یقین رکھتا ہوں، اور بڑی حد تک پابند ہوں ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مذکورۂ بالا چند سطور کے ساتھ یہ کتاب اب ناظرین کی خدمت میں پیش ہے ۔

عبدالقدوس ہاشمی

حیدر آباد دکن ۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۳ء

یقین و عمل

(عملی فلسفہ، ہر وقت بکار آمد)

کتاب Belief and Action یہ کتاب انگلستان و امریکہ میں بارہا شایع ہو چکی ہے انگلستان کے "نیشنل انسٹیوٹ فار بلائنڈ" نے یہ کتاب اندھوں کے استعمال کے واسطے ابھرے ہوئے حروف میں بھی شایع کی ہے۔

کتاب حالیہ ادب میں فلسفۂ اجتماع اور اخلاق و تہذیب کی آمیزش کی وجہ سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے فلسفہ کو عملی زندگی میں کس طرح کارآمد بنایا جائے، یا کارآمد بنایا جاتا ہے یہ ہے اس کتاب کا موضوع اور اپنے موضوع پر یہ دنیا کی بہترین تصانیف میں سے شمار ہوتی ہے

مصنف۔ لارڈ سیموئل

پی۔ سی، جی۔ سی، بی۔ جی، بی، ای، ڈی، سی، ایل، (آکسن)

۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے بیلیل کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۸ء تک پھر ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک برطانوی پارلیمان کے رکن رہے ۱۹۰۵ء میں انڈر سکرٹری ہوئے پھر مختلف عہدوں پر سرفراز رہے ۱۹۱۶ء میں دولت برطانیہ کے وزیر داخلہ ہوگئے جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک فلسطین میں برطانوی ہائی کمشنر رہے برطانوی پارلیمان میں لبرل پارٹی کے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک قائد رہے۔ پھر ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء میں یہ دوبارہ وزیر داخلہ رہے ۱۹۳۷ء میں بسرت تاجپوشی یہ وائیکونٹ بنائے گئے۔ علمی اعزاز کے اعتبار سے یہ بیلیل کالج کے رفیق اعزازی اور ۱۹۳۱ء سے برطانوی انسٹیوٹ آف فلاسفی کے صدر ہیں۔

تصانیف اس کتاب کے علاوہ ان کی حسب ذیل تصانیف نہایت مقبول ہیں

1. Liberalism : Its principles and proposals,
2. The War and Liberty
3. Philosophy and the ordinary man
4. The Tree of Good and Evil
5. Practical Ethics

پہلا باب

دورِ انتشار

دورِ انتشار

یہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ موجودہ دور یعنی وہ زمانہ جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک دورِ انتشار ہے، ہر چیز میں انتشار ہے، مذہب میں، فلسفہ میں، سیاست میں، اخلاق میں، انتشار کہاں نہیں ہے؟ یہ زمانہ ہی شک و ریب کا زمانہ ہے۔ جدید علوم نے مذہبی پابندی کو دماغ انسانی کے پچھلے پردوں میں پہنچا دیا ہے۔ ہزاروں ہیں جن پر مذہب اور روایات مذہب کی گرفت باقی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی اور مذہب کے ابین کوئی علاقہ نہیں رہا۔ فلسفہ کا یہ حال ہے کہ کوئی صریح پیغام اس سے نہیں ملتا، عام آدمی کے لئے فلسفہ دور کی غیر مفہوم اور الجھی ہوئی آواز سے زیادہ کچھ نہیں۔ سیاست جس مقام پر ہے، صاف ظاہر ہے، آزادی عمل اور انصاف کے بنیادی اصول ہی کو آج اُن جماعتوں کی طرف سے ٹھکرا دیا گیا ہے جو دنیا کی مختلف بڑی بڑی مملکتوں میں اختیار و اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں افلاس کا دور دورہ ہے، ایک طرف تکلفات زندگی اور دولت کی فراوانی ہے تو ٹھیک اسی کے سامنے افلاس و محتاجی بھی موجود ہے اور نسل در نسل تک افلاس سے نجات نہیں ملتی، اس کا لازمی ردعمل یہ ہو رہا ہے کہ قلوب میں ایک قسم کی سخت بے اطمینانی پیدا ہو گئی ہے جو ہمارے سماج کے پورے ڈھانچے ہی کو ختم کئے دیتی ہے، ایک عالم گیر جنگ کی آفتِ آسمانی دماغوں میں

عدم تحفظ کے خیالات کو جاگزیں کرچکی ہے۔ ہر جگہ ہمیں غیر متیقن صورت حال، سوال اور پریشانی سے واسطہ پڑتا ہے۔

ہمارے زمانہ کی بے اطمینانی کا جوش سارے عالم پر محیط ہے۔ مشرق ہو کہ مغرب، چین ہو یا جاپان، ہندوستان، ترکی، روس، یورپ کے ممالک ہوں یا امریکہ کے، غرض ہر جگہ یہی حال ہے اور ہر شخص کا یہی حال ہے، بدھیون، کنفیوشین، ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی، کسے سکون و اطمینان نصیب ہے؟ ماضی سے جو خیالات وراثت میں ملے، اُن پر اعتماد نہیں رہا۔ موجودہ صورتِ حال پر اطمینان نہیں اور مستقبل کا صاف تصور دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستقبل کو درحقیقت کیسا بنانا چاہتا ہے۔ اور نیا نظام کیا ہوگا۔

بلاشبہ کچھ افراد ہر ملک اور ہر مذہب میں اب بھی ایسے موجود ہیں جو ان حالات سے متاثر نہیں ہیں، بعض اپنے مذہبی عقائد پر مضبوطی سے قائم ہیں انھیں اپنی ساری زندگی کے لئے ایک متعین و واضح مذہبی لائحہ عمل حاصل ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو کسی خاص فلسفہ کے معتقد ہیں جسے اُنھوں نے خود متعین کرلیا ہے یا فاضل اساتذہ سے حاصل کیا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر پوری کائنات میں نہیں تو کم از کم انسانی سوسائٹی میں ان کو اپنا مقام معلوم ہے۔ یہ درست ہے، لیکن ظاہر ہے کہ صرف اسی قدر، کافی نہیں، اس حقیقت سے قطع نظر ممکن نہیں کہ بہرحال کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ جس کو عام طور پر تسلیم کرلیا جائے، ہماری تہذیب اس طرح غیر متعین حالت میں نہیں رہ سکتی کہ اپنے عقائد، سیاست، آئندہ نسلوں کی تربیت اور افراد، طبقات اقوام اور نسلوں کے باہمی تعلقات کے محض بے بنیاد ہونے کا خوف دلوں پر

طاری ہو، اور یہ تصور قائم ہو کہ یہ ساری وسیع و عظیم الشان عمارت محض کھوکھلی، کمزور، اور ہمہ دم لرزاں ہے۔ مفکرین عالم کی پوری جماعت جنھیں ہمیشہ سے زیادہ موجودہ دور نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے، اس صورت حال سے گھبرا رہی ہے، اُسے خطرہ بالکل سامنے دکھائی دے رہا ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حقیقتاً ہم اس کے سوا اور کچھ کر بھی سکتے ہیں؟

کیا ہمیں قدیم مذہبی تقشف، اور رسوم کی طرف لوٹ جانے کی کوشش کرنی چاہیئے، کیا ہم اپنی مرضی کا نام عقیدہ رکھیں، یا کسی دوسرے کے یقین پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو بیٹھیں؟

کیا ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ خیالات و عمل کی آزادی ہی نے یہ عالمی انتشار پیدا کر دیا ہے، اس غیر ضروری آزادی کو ہمیں خیرباد کہہ دینا ہی چاہیئے۔ جو ذہانت سے خیالات پر قابو پا سکے، اور صلاحیت سے اقتدار پر قبضہ جما سکے، ہمیں اُس کا ساتھ دینا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم "اخلاقی نراج" کے خوف سے "دماغی جبروت" کو قبول کر لیں۔

یا تن بہ تقدیر ہو کر کنارہ کش ہو جائیں؟ ہاں! ہم گبن کی طرح کہ تو سکتے ہیں کہ:
"تاریخ کیا ہے، نسل انسانی کی محرومیوں، حماقتوں، اور جرایم کی داستان کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اگر یہی ہے تو پھر اس کے برخلاف کیوں ہو، اب بھی وہی ہو رہا ہے، ہونے دو!

یا مختلف مذاہب، اور مختلف فلسفوں میں سمجھوتہ ہو جائے، کیا کبھی ایسا ہوا ہے؟ اور کیا سمجھوتے کی بنیاد پیدا ہونے کا ادنیٰ امکان بھی موجود ہے؟

اِن سب کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ حقیقتہً انسانیت کی بناء کس پر ہے حق کیا ہے۔

صحیح کسے کہتے ہیں، اور غلط کس کا نام ہے، چلو! تھوڑی دیر کے لئے ہم ان سب کو چھوڑ کر شراب و کباب سے جی بہلائیں، حسن کاری و دلچسپی کی پناہ لیں، انسانیت کو اس کی محرومیوں، حماقتوں، اور جرائم میں پڑی رہنے دو، ہم ان آفتوں کو جو ہمارے حصہ میں آئیں گی جھیل لیں گے —— لیکن کیا ہم سے یہ دیکھ کر صبر ہو سکے گا کہ دنیا پھر ایک بار ایپیکیورین، سائنکس، اور اسٹوئکس میں تقسیم ہو جائے —— تباہی دیر یا سویر بہرحال آکر رہے گی اور یقیناً اسی راستہ پر دنیا کو لے جائے گی جسے رومیوں اور یونانیوں نے معلوم کیا تھا۔

بڑے بڑے مسائل جہاں کے وہیں رہ گئے، ہم کائنات کی دلفریبی و عظمت کا گہرا احساس کر چکے ہیں، ہم مدتوں سے یہ سن رہے ہیں:

ہر اک غنچہ جہاں میں اک زبانِ حال رکھتا ہے

ہمیں ہمیشہ سے معلوم ہے کہ:-

دریا کی روانی میں • ہر شعلہ فشانی میں
لیلیٰ کی جوانی میں مجنوں کی کہانی میں
اک راز ہے سربستہ
اک راز ہے سربستہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ رجعت قہقری کر کے صرف غیر متعلق بن جانے پر اطمینان کر بیٹھیں، ایک اور صورت باقی رہ جاتی ہے، اور یہ وہی صورت ہے جو ماضی میں سوسائٹی کو انتشار و تباہی سے بچانے کے لئے بارہا استعمال کی جا چکی ہے۔ یہ انسانوں کا فریضہ ہے کہ جہاں کہیں ہوں، اپنی تمام تر دماغی صلاحیتیں عصری مسائل کو سلجھانے میں صرف کر دیں، اور مسئلہ کو مقامی، نسلی، یا قومی بنا کر نہ دیکھیں بلکہ اس پر ایک بسیط نظر ڈالیں، اور مجموعی طور پر دیکھیں، اس سے ہرگز نہ گھبرائیں

کہ تمدن کی بنیادوں کی تنقیح کرنی ہوگی، ان بنیادوں پر نظر ڈالنی ہوگی جن پر تہذیب کی موجودہ عمارت قایم ہے ——— اگر ضرورت ہو تو بنیادی تصورات کو بھی بدل کر دوسری شکل دیں۔

غالباً ہم اس وقت ایک مختلف دور کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں، پروفیسر وہائٹ ہیڈ مشہور دوراندیش فلسفی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ

"ہم ایک ایسے دَور میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مذہب، علوم اور سیاسی خیالات کی تنظیم جدید کرنی ہوگی۔"

اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ

"اِس دور میں اگر لوگ صرف دو کناروں کے مابین جاہلانہ اہتزاز کے ذریعہ بچ نکلنا چاہیں، پھر بھی یہ دَور صداقت کو انتہائی گہرائیوں سے تلاش کرلائے گا۔"

دوسرا باب

عالمِ محسوسات

عالمِ محسوسات

یہ عالمِ محسوسات جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے، اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے تین رُخ زیادہ مانوس ہیں۔

اول: عام انسانی نظر سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، یعنی محسوس کا ظاہر رُخ،

دوم: عالم کا وہ رُخ جو علوم طبعیہ نے ہمارے سامنے منکشف کیا ہے۔

سوم: عالم کا حیاتی، ذہنی، اور نفسی در وحانی رُخ ـــــــ جس نام سے چاہیں تعبیر کریں۔

عام انسانی نظر سے ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے، وہ عالم مادہ ہے، یہ ٹھوس ہے، جس میں حجم ہے، وزن ہے، رنگ ہے، بُو ہے، گرمی و سردی ہے۔ مثلاً گلاب کا پھول سُرخ ہے، خوشبودار ہے، گھاس سبز ہے، آگ گرم ہے، برف سرد ہے اس عالم میں مختلف آوازیں ہیں جنھیں ہم سنتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے، غروب ہوتا ہے، رات کو ہزاروں چھوٹے چھوٹے ستارے آسمان پر چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس عالم میں ہوائیں بھی ہیں، اور موسم بھی ـــــــ ہوائیں جدھر رُخ ہوتا ہے چلتی ہیں۔ اور انسان اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں ـــــــ اتفاقات و حوادث کو بھی حالات و واقعات میں کافی دخل ہے، کسی کو لاٹری میں لاکھوں کا انعام مل جاتا ہے، اور کوئی

دو ریلوں کی ٹکر میں جان کھو دیتا ہے۔

اس دنیا میں وقت ایک شئے ہے، اور فاصلہ بالکل دوسری شئے، گھڑی اور کلینڈر سے ہم وقت کی پیمائش کا کام لیتے ہیں، اور فٹ، گز اور جریب، سے فاصلہ کی پیمائش کا۔ غرض کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز اور بالکل علٰحدہ ہیں۔

یہ ہے وہ عالم محسوسات جسے ہمارے بزرگوں نے دیکھا، ہم دیکھ رہے ہیں اور ہمارے بچے بھی دیکھیں گے۔ ہزاروں سال سے یہ ایسا ہی ہے، شاید ایک عام اِحساس کی حدتک صدیوں سے جانور بھی اسے ایسا ہی دیکھ رہے ہیں۔ اور اِنسان بھی۔

اِس عالم محسوسات کا دوسرا رُخ لیجئے۔ یہ وہ رَخ ہے جس پر سے نقاب طبعی علوم نے اُلٹی ہے، اِس رخ سے عالم بالکل ہی دوسری چیز ہے، طبعی علوم پر لکھی جانیوالی کتابوں، اور رسائل نے ہمیں اس سے روشناس کرایا ہے، اور ہمارے اساتذہ کے لکچروں نے ہمارے سامنے اس کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ یہ ہے۔ ذرات، سالمات، برقیات، اور ایجابی وسلبی موجوں کی دنیا۔ اس میں شعاعیں ہیں، اکسریز ہے، گما ریز ہے، الٹروائیلٹ (مافوق البنفسجی) ریز ہے، ہرٹزین ریز ہے ——— اس میں بھی یہ سب چیزیں ایک دوسرے سے پورے اِمتیاز اور پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں ——— غرض سارے عالم میں بجلی ہے، شعاع ہے، سالمات ہیں، ذرات ہیں، وغیرہ وغیرہ

اِس دنیا میں وقت ناقابل پیمائش ہے، گھڑی بے قیمت ہے، فاصلہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں، ایک سکینڈ میں سیکڑون بلکہ ہزاروں میل میں موجیں پھیل جاتی ہیں، شعاعوں کے مختلف انعکاسات، ان کا تقاطع خود ایک عالم ہے، آپ

عام انسانی نظر میں رنگ کہہ رہے تھے، لیکن اس شے کا اس دنیا میں کہیں وجود نہیں ۔۔۔۔۔۔ "گلاب کا پھول سُرخ ہے"، طبعی علوم نے عالم کا جو دوسرا رخ ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے اس میں اس جملہ کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ بلکہ اسکے لئے صحیح بیان یہ ہوگا کہ :-

"گلاب کے پھول کی بالائی سطح کچھ اس قسم کے سالمات سے بنی ہوئی ہے کہ وہ روشنی کی سفید کرنوں کا بڑا حصہ اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ اور کرنوں کا وہ جذب شدہ حصہ جب منعکس ہوکر لوٹتا ہے تو ایک ملی میٹر کے اسی ہزار ویں حصہ تک طویل موج پیدا ہوتی ہے ۔۔۔ اگر چشم انسانی اس لوٹنے والی کسی کرن کی راہ میں پڑ جاتی ہے تو یہ جلیدیۂ چشم کے ذریعہ جذب ہوکر چشم انسانی کے پیچھے موجود تقریباً ڈھائی لاکھ ریشوں کو متاثر کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دماغ کے ایک خاص حصہ میں ایک ہیجانی تاثر پیدا ہوتا ہے اور اسی کو ہم اپنی زبان میں "سُرخی" سے تعبیر کرتے ہیں"

یہی حال بُو کا ہے، طبعیات کی دنیا میں بُو، آواز، گرمی، سردی، کہیں کچھ نہیں، سالمات کا تصادم ہے، شعاعوں کی موجیں ہیں، اہتزازات ہیں، اور تاثرات ہیں، نہ آگ گرم ہے اور نہ برف سرد؛

آفتاب طلوع نہیں ہوتا، بلکہ ہم لوگ خود ایک ایسے کرہ پر بستے ہیں جو اپنے محور پر، اور آفتاب کے گرد سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل کی رفتار سے ہر وقت گھوم رہا ہے اور ظاہری طور پر آفتاب نکلتا اور ڈوبتا معلوم ہوتا ہے، کیا کہا؟ چھوٹے چھوٹے تارے! تارے چھوٹے نہیں بلکہ زمین سے ہزاروں گونہ بڑے، اور اتنی تعداد میں ہیں کہ ہماری گنتی شاید کام نہ دے سکے، زمین سے بیس لاکھ گونہ بڑے تارے، ہی لاکھوں سے متجاوز بلکہ کروڑوں موجود ہیں۔ فاصلہ اور منت کش پیمانہ! ۔۔۔۔

اِس دنیا میں ایک کروڑ میل فی منٹ چلنے والے ستارے اُس راہ پر چل رہے ہیں جسے شاید وہ پچیس کروڑ سال میں بھی طے نہ کرسکیں گے ——— اتنا ہی نہیں بلکہ طبعی علوم نے عالم محسوسات کا جو رُخ ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے اس میں فاصلہ اور وقت ایک دوسرے سے مِل جاتے ہیں، امتیاز اور علیحدگی باقی نہیں رہتی ——— اس عالم میں حوادث و اتفاقات بھی نہیں پائے جاتے ہیں ہر واقعہ اثر ہے اپنے پچھلے بہت سے واقعات کا ——— اور ہر حادثہ گذشتہ بہت سے وجوہ وعلل کا لازمی ولابدی نتیجہ ہے، نہ کہیں حادثہ ہے، اور نہ کہیں اتفاق، جیسے اسباب مہیا ہونگے ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے، فطرت کا اصول علت و معلول ہر جگہ اور ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔

یہ تھا عالم محسوسات کا مادّی رُخ جو علوم طبعیہ کے ہاتھوں بے نقاب ہوا ہے۔ یہ درحقیقت خالص مادہ پرست کی نظر سے دُنیا کا مطالعہ ہے ——— ایک زمانہ تھا کہ بہت سے سائنس داں اسی دنیا میں آکر اطمینان کا سانس لیتے تھے، یہاں تک کہ یہ پیشین گوئی بھی کردی گئی تھی کہ آئندہ کی تحقیقات اُن تمام مظاہر قدرت کو جو اب تک ہمارے حیطۂ علم سے باہر ہیں ان ہی مادیات کے چوکھٹے میں لے آئیں گی، ان مظاہر قدرت میں بڑے مظاہر، مظاہر حیات و مظاہر نفس ہیں ——— اَب تک جو کچھ تحقیقات ہوئی ہے اس کے اعتبار سے تو یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی، اور یہ اُمید ٹوٹ گئی، حیاتیات کا فن روز بروز مادیت سے بلند تر اور بڑی حد تک علیحدہ ہوتا جارہا ہے ——— پروفیسر ولڈن کار (Wildon-Carr) نے فلسفہ کے نقطہ نظر سے لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"ایک مادّی شے مثلاً بلیرڈ کا گیند، بہرحال جو کچھ ہے وہ موجود ہے، کسی جگہ کسی وقت جب گیند پایا جائے گا تو گیند کا سب کچھ اس میں موجود ہوگا، لیکن ایک ذی رُوح مثلاً ایک جرثومہ، ایک بیج، جانور یا انسان جب کسی جگہ کسی خاص وقت

میں پایا جاتا ہے تو کبھی اُس میں اُس کا سب کچھ موجود نہیں ہوتا۔ ماضی کا بہت کچھ اس میں اُس وقت موجود نہیں ہوتا، اور مستقبل میں اس سے بہت کچھ ظاہر ہونیوالا ہے جو بالفعل موجود نہیں ہے۔ ذی رُوح کے اجزائے ترکیبی اس کی عین حقیقت نہیں ہیں۔ ایک شاہ بلوط کے پھل کو لیجئے بالقوۃ وہ ایک شاہ بلوط کا درخت ہے چاہے اُسے درخت بننے کا موقع نہ ملے اور پاؤں میں کچل دیا جائے۔ سالمات کا پورا تجزیہ، اجزاء ترکیبی کی صحیح تحلیل، پھر اُن کے باہم امتزاج و اقتران کی پوری تاریخ بھی شاہ بلوط کے پھل کی حقیقت کو واضح نہیں کرسکتی۔ ایک ماہر فن اپنی تجربہ گاہ میں شاہ بلوط کے پھل کی پوری تحلیل کرسکتا ہے، اس کے تمام اجزاء ترکیبی کو پھر سے مرکب کر کے شاہ بلوط کے پھل کو بنا بھی ڈالے جب بھی حقیقت روشن نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ اس کے ماضی پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی نے کس طرح اس کے مستقبل کے لئے ایک خاص قوت اُس میں ودیعت کی ہے —— یہ ہے ذی رُوح اور غیر ذی رُوح کے مابین ایک عظیم الشان فرق، غیر ذی روح میں اجزاء ترکیبی، خاص ترکیب اور واقعیت سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن ذی روح میں اس کے علاوہ ایک اور چیز ہے وہ ہے اس کی حقیقت، اور نفس الامری، مقناطیس سوئی کو کھینچ لیتا ہے، اور سوئی اُس کی طرف خود بخود کھینچتی ہے۔ یہ ایک واضح مشاہدہ ہے۔ لیکن ذرا کسی شاطر کو دیکھئے ایک گھنٹہ تک وہ اس پر غور کرتا ہے کہ آئندہ کی چال کیا ہو، پیادہ چلے، یا فرزین، ایک خانہ چلے یا دو خانے، آخر میں وہ کسی چال کے متعلق فیصلہ کر لیتا ہے، کیا کسی تشریح و توجیہ سے آپ اس کو اسی اصول کے ماتحت لاسکتے ہیں جس کے ماتحت سوئی مقناطیس کی طرف حرکت کرتی ہے۔ فرض کیجئے ایک ڈرامہ نویس اپنے ڈرامہ کا دوسرا سین لکھنے کو بیٹھتا ہے، ایک ریاضی دان ایک سوال کو حل کرنے میں انہماک برتتا ہے یا ایک مغنی کچھ گاتا ہے۔ اِس میں کیا شک ہے کہ

طبعی علوم جو کچھ ہمیں بتا سکتے ہیں، اُن سے مختلف کوئی چیز یہاں موجود ہے جو کام کر رہی ہے۔ اگر آپ ایک اُونی کپڑے کی تشریح کرنے لگیں تو صرف تاروں کی تشریح، اِن تاروں کے ریشے اور ریشوں کے اجزا کی توضیح کر کے حقیقۃً کپڑے کی مکمل توضیح کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ——— بہت سی اہم باتیں باقی رہ جائیں گی مثلاً بھیڑ کی نفسی صلاحیتیں جن کے ماتحت انھوں نے چارہ حاصل کیا اور اُن کی نسلیں بڑھیں ان کی حیوی قابلیت جن کے ماتحت اُون اُن کے بدن پر بڑھتے رہے، اسی طرح اِنسانوں کی ذہانت جن سے انھوں نے بھیڑوں کو پالا، مشینیں بنا کر تیار کیں، اُون کو دُھنکا، تار بنائے، اُنھیں بُن کر کپڑا بنایا، اور اِستعمال کرنے لگے ——— اگر ان تمام اُمور کو آپ نے نظر انداز کر دیا تو، باقی کیا رہ جائے گا، ذرات، سالمات، موج برق، لیکن کپڑا ختم ہو جائے گا۔ کپڑے کے وجود کے جو حقیقی اسباب ہیں وہ ہیں مظاہرِ حیات، و مظاہرۂ نفس۔

ذرا نمو کے عجیب وغریب مظاہرہ پر غور فرمائیے، ہم گھاس کو بڑھتے ہوئے، کلیوں کو کھلتے ہوئے، چوزوں کو انڈوں سے نکلتے ہوئے ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں، اِس لئے کبھی اِس مسئلہ پر غور نہیں کرتے کہ آخر یہ سب چیزیں کہاں سے آرہی ہیں۔ حیاتیات کا فن ہمیں بتاتا ہے کہ ذی روح کی نشو ونما غیر عادتی طور پر خلیات کی تقسیم سے عمل میں آتی ہے۔ لیکن یہ اس طرح نہیں ہوتا جیسا کہ بلور کے وجود میں ہوتا ہے۔ عضویاتی نشو ونما اور غیر عضویاتی ترکیب اکثر حالات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف صورت رکھتی ہے۔ علم الجنین سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک قابل تولید جرثومہ مختلف نمودار اجزا میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ مضغہ، کچھ عصب، کچھ ہڈیاں، کچھ چمڑا، کچھ دل، کچھ پھیپھڑے بنتے ہیں، اور یہ سب اپنی اپنی جگہ پر صحیح تناسب سے تیار ہوتے ہیں ——— سائنس ان تمام حالات کو ایک مشاہدہ

شدہ حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن صرف مشینی حرکت کے ماتحت اجزاءِ کیمیاوی اپنے آپ کو اس قدر باقاعدہ مرتب نہیں کر سکتے ـــــــ یہاں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک جزء میں وہ کون سی طاقت ہے جو مخصوص طریقہ پر اُس کو بڑھنے اور خاص مقام پر اُس کو قرار پذیر ہونے پر مجبور کرتی ہے ـــــ یقیناً اس جگہ کسی عظیم الشان طاقت کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کے ماتحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے ـــــ اِس طرح ہمارے گرد پھیلے ہوئے عالم محسوسات کا تیسرا رخ سامنے آتا ہے۔ اور اس کا نفسی، روحانی اور غیر مادی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں رُخ اسی ایک عالم کے ہیں۔ اور بلا شبہ یہ ساری داستان اُسی ایک دنیا سے متعلق تھی، ہم صبح سے شام تک جس عالم کا ذکر کرتے ہیں حقیقۃً وہ سائنس یا علم النفس کی دُنیا سے بالکل مختلف عالم ہوتا ہے، ایسا سمجھئے کہ ہم اپنی گفتگو میں ایک لفظ بولتے ہیں جس کا مفہوم علمی نقطہ نظر سے ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ بہر حال صرف ایک ہی دنیا ہے جو ہمارے دسترس میں ہے۔

اَب رہا یہ کہ اس دنیا کی حقیقت کو ہم جانیں، اس میں ہم سے غلطیوں کا امکان ہے، بلکہ ہم اکثر اس بارے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک مدت تک عوام یہ مانتے رہے ہیں کہ زمین کے گرد جو حرکت آفتاب کی معلوم ہوتی ہے وہ درحقیقت ایک فریب نظر ہے ـــــ سائنس کے نظریئے جو کل تھے وہ آج نہیں رہے، اور جو آج ہیں یقیناً ان میں سے بھی کل آنے والی نسلیں بہت سے نظریوں کو باطل قرار دے کر دوسرے نظریئے قایم کریں گی ـــــ بعض مقامات پر صریح عدم تطابق بھی پایا جاتا ہے، ہمیں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ جہاں تک ہماری تحقیق صحیح ہوتی ہے، واقعات اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن جہاں واقعات ساتھ نہ دیں، یقیناً وہاں ہماری تحقیق صحیح نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک غلط

قیاس رہ جاتا ہے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب خود مشاہدات میں تضاد واقع ہو تو کس طرح اُنھیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دیوار کا ٹھوس ہونا صاف ظاہر ہے، لیکن کسی براڈکاسٹنگ اِسٹیشن کی دیواروں سے لہریں بالکل اُسی طرح صفائی کے ساتھ گزر کر دوسری جگہ چلی جاتی ہیں، جیسے وہاں دیوار نہ ہوتی تو جا سکتی تھیں، پھر دیوار کا ٹھوس ہونا جو مشاہدہ سے ثابت تھا محض ظاہری دھوکا ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجیے تو آخر دونوں باتیں صحیح کیوں نہ مان لی جائیں دیوار ہمارے لئے ٹھوس ہے، لیکن لہروں کے لئے نہیں ہے۔ ہماری کھڑکی کے اوپر لگا ہوا شیشہ روشنی کو نہیں روکتا، لیکن پانی کی بوندوں، اور مکھیوں کو روکتا ہے۔

قوی خوردبینوں، اور دوربینوں کی ایجاد نے جب سائنس کو اِس قابل بنا دیا کہ وہ اس عالم محسوس کا ایک جدید رخ بے نقاب کرے، تو عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ ظاہر طور پر جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا رہتا ہے یہ سب تو دنیا کی محض ظاہری شکلیں ہیں، اب علمی تحقیقات سے جو معلوم ہوا ہے وہ ہے حقیقی عالم ——— لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جدید تحقیقات سے جو معلوم ہوا وہ حقیقی عالم کیوں ہے، اور جو صاف وصریح طور پر پہلے سے ہمیں معلوم تھا وہی حقیقی عالم کیوں نہیں ہے؟ کیوں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شعاعیں، سالمات اور برق ہی عالم کے حقایق ہیں ——— بالکل اسی طرح اگر ذہنی رُخ کو تسلیم کر لیا جائے، اور وجود مادی کو نہ تسلیم کیا جائے تو سوال باقی رہ جاتا ہے ——— ایک معمار کا ذہنی مکان کیوں حقیقی مکان ہے، اور بنا بنایا مکان کیوں حقیقی نہ سمجھا جائے۔ یا بصورتِ دیگر۔ کیا دلیل ہے کہ یہ ظاہری اینٹ پتھر کا مکان ہی حقیقت عالم ہے اور ذہنی مکان جو اس مکان کے ٹھیک اس صورت میں بن کر تیار ہونے کی ابتدائی

واصلی علت ہے۔ کیوں محض فرضی و غیر حقیقی سمجھا جائے۔

سچ یہ ہے کہ نہ یہ غیر حقیقی ہے اور نہ وہ، ذہنی رُخ کسی طرح طبعی رُخ سے اور طبعی رُخ عام ظاہری رخ سے کسی طرح کم حقیقی نہیں اور نہ اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ حقیقی کہا جا سکتا ہے ——— اسپونزا کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے سر فریڈرک پولک نے لکھا ہے:-

— ”خیالی دنیا اعیانی دنیا کی نہ مخالف ہے، اور نہ اُس میں دخل انداز ہے بلکہ ہم ہر جگہ ایک ہی حقیقت کو مختلف رخوں میں دیکھتے ہیں، فطرت حقیقتہً واحد بھی ہے اور یکساں بھی۔“

تیسرا باب

معلوماتِ سائنس

معلوماتِ سائنس

ہمیں تلاش ہے اُن اَسباب کی جن کی وجہ سے ایک اَندرونی بے چینی ہمارے زمانہ میں طاری ہے، اور ذہن اِنسانی یاس کی طرف مایل ہو رہا ہے —— اِن اَسباب میں سے ایک سبب فن ہئیت کی جدید تحقیقات کو بھی بتایا جاتا ہے۔

جب ایک اوسط درجہ کا آدمی جو اس مانوس عالم میں معمولی طور پر زندگی بسر کر رہا ہو، اُس عظیم الشان، اور وسیع عالم تکوین سے روشناس ہوتا ہے جو فن ہئیت نے پیش کیا ہے تو مبہوت سا ہو جاتا ہے، ان معلومات سے تقریباً وہی کیفیت اس کی ہو جاتی ہے جو کسی شخص کی دوران سر کی حالت میں ہو۔ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکایک پاؤں کے تلے ایک غار پیدا ہو گیا جس کی گہرائی کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ لمبائی و چوڑائی کا —— اِس لئے اِنسان اُن سرد بے پناہ وسعتوں کے مقابلہ میں اپنی ذات کو نہایت حقیر اور بالکل کھویا ہوا پاتا ہے۔

"اِنسان کو چاہیئے کہ اپنے نفس کو اس پر راضی کرلے کہ وہ ایک ذرۂ خاک کا حقیر باشندہ ہے۔ اور حیاتِ اِنسانی کی تعبیرات میں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دے۔"

—— یہ ہے سر جیمس جنس کا مقولہ جسے عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے ——

ہمیں بتایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام آثار جو اس کرۂ اَرضی پر پائے جاتے ہیں، وہ بہرحال بے ثبات ہیں، لازماً ایک وہ وقت آنے والا ہے جب کہ حرارت آفتاب کا انتشار زمین کو بالکل سرد کر کے ناقابلِ بُود و باش بنا دے گا۔ بالآخر زمین کا حشر بھی کرۂ ماہتاب کی طرح ہونے والا ہے جس میں حیات کا کوئی اَثر موجود نہیں ہے۔

اِک سوختہ دنیا ہے، یہ عالمِ ویراں ہے
یا شب کی گزرگہ پر اِک لاشۂ بےجاں ہے

آج چاند کی حقیقت صرف اِس قدر ہے کہ وہ ہماری زمین کے ساتھ کسی فاتح رومن جنرل کے ہمرکاب غلام کی طرح چکر میں ہے۔ زمین والوں کو یہ یقین دلانا کہ خود زمین کا بھی اُس کی تمام دلفریبیوں، اور زیبائشوں کے ساتھ یہی حشر ہونے والا ہے۔ کیا اُنھیں ختم کر دینے کے برابر نہیں ؟۔ اگر انسانی تگ و دو کا یہی انجام ہونے کو ہے تو ہم جنرل اِسمٹس کے بیان "ایک ہمدم کائنات" کو کِس طرح قبول کریں۔

ہمیں کہا جاتا ہے کہ "توانائی کے اِنتشار" کے ضابطہ کے مطابق خود یہ کائنات بھی بالآخر پردۂ عدم میں پہنچ جانے والی ہے، اور یقیناً یہ ہو کے رہے گا، اُسے رُوکا نہیں جا سکتا ——— مسٹر برٹرنڈ رسل نے جینس صاحب کا ایک اور مقولہ نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

"کائنات کے ساتھ رہنا، مُردوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مرادف ہے، حیات کا اِمکان صرف اِس قدر ہے کہ قبر کی طرف بڑھتے چلو"

اِس ملیامیٹ کر دینے والے نتیجہ سے مسٹر رسل بھی کوئی مفر نہیں پاتے، اِن دونوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مفکرین نے یہ خیالات پیش کئے ہیں۔

اس قسم کے خیالات نے عوام کی ذہنیتوں کو متاثر کر دیا ہے۔ اس طرح جدید علم ہیئت نے اپنے بیانات کے ذریعہ وہ ذہنی یاس پیدا کر دیا ہے، جو ہمارے موجودہ دور پر چھا رہا ہے۔

دنیا کے مذکورۂ بالا حشر کے سوا اور بھی شکل ہو سکتی ہے۔ ہمارے ماہرین علم طبیعیہ بتاتے ہیں کہ زمین کی عمر تقریباً دس کروڑ سال ہے، اختتام عمر کے وقت آفتاب کی حرارت زمین کے لئے ناقابل حصول ہو جائے گی، اور یہ زمین زندگی کا گہوارہ بننے کے قابل نہ رہ سکے گی۔ دور حجری سے آج تک جو زمانہ گزر چکا ہے، اس کو منہا کرنے کے بعد بھی ایک کروڑ سال زمین کے سرد ہونے کو باقی رہ جاتے ہیں۔ خود مسٹر جینس نے بھی اس ظلمت یاس میں ایک روشن نشان بنا دیا ہے جس سے ہم زمانہ کی وسعت اور طول کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ نشان قطو بطرہ (ٹیمز کے بند پر ۶۸ فٹ بلند مینار) زمین کی اب تک جتنی عمر گزر چکی ہے، اس کا نشان ہے، تو اس کے مقابلہ میں اس کرہ پر انسان کی عمر صرف ایک پنی (پیسہ) کی موٹائی کے برابر ہوگی، اور تہذیب کے پانچ ہزار سال کا گزشتہ زمانہ اس کے مقابلہ میں صرف اس قدر ہوگا جتنا ایک ڈاک کے ٹکٹ کی دبازت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جناب جینس صاحب حساب لگا کر فرماتے ہیں، ایک ٹکٹ پانچ ہزار سال کی مدت کو بتاتا ہے، اور اس طرح ٹکٹ پر ٹکٹ لگاتے چلے جاؤ۔ آفتاب کے سرد ہونے کو ابھی اتنی مدت باقی ہے کہ "مونٹ بلیک" کے اتنا بلند ہو جائے گا۔

غور تو فرمائیے! مدت و زمانہ کا یہ طول اس قابل ہے کہ اس کا تصور انسانی زندگی پر اثر انداز ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ہماری زندگیوں کی مدت، اور آفتاب کے سرد ہو جانے کی مدت میں کوئی تناسب ہی نہیں ہے۔ اس لئے ہماری زندگی

اس سے اثر پذیر نہیں ہو سکتی اس طرح مندرجہ بالا ساری باتیں غیر متعلق ہو کر خارج از بحث ہو جاتی ہیں۔

مزید برآں، اس کا کس طرح یقین حاصل کیا جائے کہ آئندہ کی تحقیقات کچھ جدید تکوینی حالات کو ظاہر نہ کریں گی جو نہ صرف آج تک ظاہر نہیں ہیں، بلکہ خارج از تصور بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی تکوینی طاقت توانائی کے انتشار کی پابجائی کرنے میں ہمہ وقت کارفرما ہو۔ ایسی کسی طاقت کا تصور بظاہر خارج از ذہن ہو، لیکن اس ساری کائنات کی ابتدائ تخلیق سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت ہے تو آج سے لاکھوں برس بعد پیدا ہونے والی نسلوں کا فرض رہ جاتا ہے کہ وہ اسے ثابت کریں۔ اس وقت اس کی تحقیق قبل از وقت ہے۔

ہم بغور مطالعہ کریں تو حقیقتہً کائنات کی وسعت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی نہ ہم کو اس کے مقابلہ میں ذلیل وحقیر باور کرنے کی کوئی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم ستاروں، آفتابوں اور بہت سے کروں سے چھوٹے ہیں، تو لاکھوں سالمات شعاع، اور برقیات سے بڑے بھی ہیں، یہ معاملہ صرف پیمانہ کا رہ جاتا ہے، اور پیمانہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

ہمارے پیمانے خود ہمارے اپنے تناسب سے بنائے گئے ہیں، ہمارا قد پانچ چھ فٹ ہوتا ہے، اس لئے ایک ہزار میل ہمیں بہت زیادہ، اور ایک انچ کا ہزارواں حصہ بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا ہے — ہماری عمر صرف ساٹھ ستر سال ہوتی ہے اس لئے ایک ہزار سال ہمیں بہت زیادہ اور ایک سکنڈ بہت ہی کم معلوم ہوتا ہے —— ہمارے ان پیمانوں کی قدرت کے نزدیک کیا قیمت ہے، چھوٹا بڑا، طویل وقصیر وہاں کوئی معنی نہیں رکھتا —— وہ کام کرتی رہتی ہے اور فاصلہ اس کے نزدیک نہیں ہوتا —— فلکیات کے مقابلہ میں اپنے کو

چھوٹا یا حقیر شمار کرنا صرف حماقت ہے۔

ہاں، ذہن و دماغ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے اگرچہ ہم ایک ذرہ خاک کے باشندے ہیں، اور عالم تکوین کی وسعتوں کے مقابلہ میں ہمارے اجسام ناقابل لحاظ حد تک چھوٹے ہیں، لیکن پھر بھی ہم کو کمتری و عجز کا احساس نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہمیں برتری و فخر کا احساس ہونا چاہیئے کیونکہ ہمیں ذہن و دماغ عطا کیا گیا ہے جو صرف جسم کی بڑائی اور جرم کی وسعت سے کہیں برتر ہے۔ یقیناً ہمارے لئے ہمارا ذہن و دماغ فضیلت کے بڑے وجوہ ہیں ——— کسی خوردبین سے جو وسیع کائنات دیکھی جاتی ہے، بلاشبہ اس ساری کائنات سے زیادہ عجیب وہ دماغ اور وہ آنکھیں ہیں جو انھیں دیکھتی ہیں۔

روشن آنکھیں بنائیں دو دو | قدرت کی بہار دیکھنے کو
انساں کو دیے جو عقل و ادراک | برتر نہیں اس سے ارض و افلاک

ایک بار مزید غور کیجئے، یہ تصویر کائنات جو موجود ہے، اس کو بار بار دیکھئے غور کیجئے کہ کس حد تک قابل اعتماد تصویر ہے، کون سی چیزیں اس تصویر میں نمایاں ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اس تصویر سے کیا نتائج نکلتے ہیں ——— اگر برائے بحث یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عالم بس اتنا ہی ہے تو یہ سوال بہرحال باقی رہ جاتا ہے کہ سائنس نے جو کچھ معلومات پیش کی ہیں وہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، ظاہر ہے آج نظریۂ سائنس وہ نہیں ہیں جو ایک صدی پیشتر تھے، اور اسی طرح جو آج ہیں ان میں سے اکثر ایک صدی بعد باقی نہیں رہیں گے۔ کیا اس صورت میں ہم اپنے یقین و اعتقاد کی بنیاد موجودہ سائنٹفک نظریوں کو بنا سکتے ہیں؟

آئندہ کے نتائج تحقیق میں سالمات کی نوعیت اور شعاعوں کی حیثیت بدل سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بدل جائے۔ آج جو نتائج حاصل کئے گئے ہیں

خود اُن میں بھی حساب کی غلطیاں، قیاس کی چوک، اور فہم کی فروگزاشتیں ممکن ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، آئے دن ہوتا ہے، اور انسان سے ایسا ہوتا ہی رہے گا ——— اِس لئے انھیں یقین واعتقاد کی بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ سائنٹفک معلومات کو یکسر وہم و باد ہوا قرار دیکر ان سے انکار کر دیا جائے، بغیر کسی تفصیل کے ایک عمومی نقشہ کے طور پر انھیں قبول کر لینا چاہیئے، جس کی تفصیل ہر وقت و ہر زمانہ کی تحقیقات میں بدل سکتی ہے، اور بدلتی رہتی ہے۔

اِن معلومات سے کیا نتائج نکلتے ہیں ——— یہ بڑی حد تک آزمودہ چیز ہے ہر روز صبح سے شام تک مشینوں میں، مواصلات میں، صنعتوں میں ادویہ سازی میں اور زراعت وغیرہ میں ہم سائنس کے نتائج تحقیق کو آزما رہے ہیں، اِس لئے ہم مجبور ہیں کہ انھیں کسی نہ کسی حد تک تسلیم کریں ——— رہا کس حد تک، تو اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ طبعیات نے مادہ کی اَندرونی ترکیب سے متعلق جو معلومات مہیا کی ہیں وہ بہت شاندار ہیں، اُن کے ذریعہ اس نے فطرت کا راز بڑی حد تک کھول دیا ہے، مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعہ ہم منزل تک نہیں پہنچے، خود علماء طبعیات کو اس کا اقرار ہے کہ فطرت کا حقیقی راز ان علوم کی سرحد سے اب بھی کافی دور پر واقع ہے۔

علم نفسیات کی حد تک تو سائنس نے ابھی کوئی قابل ذکر ترقی ہی نہیں کی ہے نفس انسانی، اور حیات انسانی کے باہمی روابط سے متعلق ہمارا علم اتنا بھی نہیں ہے جتنا آج سے چار سو سال پہلے مادہ کے متعلق دنیا جانتی تھی ——— ابھی تو علم نفسیات اپنے لئے کسی گلیلو اور کسی نیوٹن کا انتظار ہی کر رہا ہے، جو اس کی تحقیقات میں

انقلاب بپا کر دے ــــ نفسیات برقی کے متعلق ہمارا علم ابھی طفل شیر خوار ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ماہر نفسیات نے انسانی عواطف سے مختلف برقی لہروں کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔

غرض، یہ یقینی ہے کہ ہم چاہے کسی علم پر اپنے فکر کی بنیاد رکھیں، اس علم میں مزید اضافوں کی گنجایش ہے، اور یقیناً مزید اضافے ہوتے رہیں گے۔ ہمیں فکر کو جولان کرتے ہوئے اس امکان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اگر کہیں یقین کی گنجایش ہے تو صرف اس قدر کہ ہمارا علم ناقص ہے۔ اس لئے کسی فکر میں ہمیں علم کے مکمل ہونے کا تصور قایم کر کے اُسے بنیاد نہیں قرار دینا چاہیئے، بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ آگے اس علم کا ایک جہان ہے۔ زیادہ واضح اور زیادہ روشن جواب تک ہم پر نہیں کھلا ہے۔

چوتھا باب

قدیم عقائد و جدید علوم

قدیم عقاید اور جدید علوم

دُنیا کے اُن مذاہب میں جن کے پیرؤوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے، اسلام سب سے جدید مذہب ہے اور اس کی ابتداء کو بھی تیرہ سو سال سے زیادہ ہو چکے۔ سب سے قدیم ہندویت و شنتویت ہے، اِن مذاہب کی ابتداء کو کئی ہزار سال ہو گئے — اِس جدید و قدیم کے درمیان میں مسیحیت، بدھیت، کنفوشیت اور یہودیت کی ابتداء ہوئی ہے —— آج جیسی دنیا ہے ویسی اُن مذاہب میں سے کسی کی ابتداء کے وقت نہ تھی، نمایاں طور پر اِس وقت سے یہ وقت مختلف ہے:

اولاً یہ کلیہ تسلیم کیا گیا ہے کہ فطرت کا ایک منضبط اور مقرر قانون ہے، اگر ذہنی حدود میں اختلاف بھی کیا جائے تو کم از کم حدود مادہ تک یہ بہر حال مسلم ہے کہ اسباب و نتایج میں ہم آہنگی موجود ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ "فطرت اپنے قانون کو خود کبھی نہیں توڑتی ہے" لونارڈو ڈی ونشی کا قول ہے کہ "فطرت خود اپنے اس قانون سے مجبور ہے جو اسکے اندر موجود اور کارفرما ہے"

دوم:- ارتقاء کا بنیادی اُصول کائنات میں موجود ہے۔ یہ ساری کائنات تدریجاً بن کر تیار ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ یہ ساری دُنیا کسی کے عمل کا نتیجہ ہے، یکایک کتم عدم سے منصۂ وجود پر نہیں آئی ہے، نشوونما تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔

سوم :۔ اگرچہ دنیا کا پیمانہ انسانی زندگی کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ہمارے تصورِ معبود کے لئے یہ پیمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ہینزلٹ کہتے ہیں کہ دوربینوں نے آسمان کو بہت دُور پھینک دیا ہے۔ اب تک اتنا بڑا عالم ہمارے سامنے ہے کہ جس میں سے روشنی کے گذرنے کے لئے بھی پانچ کڑور سال کی ضرورت ہے، پھر یہ ظن غالب ہے کہ اس سے آگے بھی وسعت موجود ہو، اس سے لازماً ایسے معبود کے تصور پر اثر پڑتا ہے جو ہر جگہ، اور ہر وقت بذاتہ موجود ہو؛

یہ ہیں وہ خیالات جو باستثنا کنفوشیت تمام قدیم عقائد سے ٹکراتے ہیں، کنفوشیت کوئی مذہب واعتقاد نہیں بلکہ صرف اخلاقیات ہے اِس لئے اُس سے اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

حالات کا دوسرا رُخ لیجئے، بہت سے ایسے اُمور بھی ہیں جن میں موجودہ خیالات قدیم معتقدات کی تصدیق کرتے ہیں۔

انیسویں صدی تک سائنس کو مادیت میں غلو کی وجہ سے کمال وخود اکتفائی کا دعویٰ تھا، لیکن آج وہ اپنے حاصل کردہ معلومات کے نامکمل اور ناقص ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اب تو سائنس اُس کا بھی اقرار کرتا ہے کہ "ان تمام معلومات ومتخیلات کے ماسوا کوئی اور اس عالم میں موجود ہے اور ضروری ہے کہ ہو" سائنس کا یہ اقرار معبود کے وجود کے لئے جگہ خالی رکھتا ہے ـــــــ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُصول علت ومعلول کو تسلیم کرکے، اور اس پر اصرار کرکے کہ یہ عالم محسوس ومعلوم اپنے سے آپ بن کر تیار نہیں ہوسکتا، سائنس لازماً اِس نتیجہ تک پہنچا دیتا ہے کہ یقیناً کوئی ایسا علتہ العلل اور سبب الاسباب موجود ہے جو ہمارے مشاہدہ عالم میں ہم کو دکھائی نہیں دیتا ـــــــ اگر یہی علتہ العلل اور

سبب الاسباب معبود ہے تو سائنس نے ناآستک اور لامذہب ہوجانے کا کوئی امکان باقی نہیں رکھا۔

پھر جب سائنس نے ایک ٹھوس اور یا جم عالم طبعی کو سامنے سے ہٹا دیا اور یہ تسلیم کرلیا کہ فطرت میں ایک معنوی طاقت کام کر رہی ہے تو اس نے عالم کے لئے رُوحانی نقطۂ نظر کو بہت زیادہ مستحکم کر دیا۔

مزید براں جب سائنس نے خود اس عالم کے اس رُخ کو نمایاں کر دیا جو ابتداءً پیدا ہونے والے انسان کے وہم وتخیل سے بھی باہر تھا، تو سائنس مجبور رہے کہ اس دنیا کے ایسے رُخ بھی تسلیم کرے، جو موجودہ نسل کے وہم وتخیل سے اب تک باہر ہے۔

جب ہم اس ساری کائنات کو دیکھتے ہیں کہ یہ شعاعوں، محرکات، انعکاسات اور باہم نفوذ و انجذاب کا ایک منظم کارخانہ ہے اور کسی نہ کسی طرح ہم اجمالی طور پر یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس عالم کے بعض رُخ ہمارے مشاہدہ سے بالکل مختلف بھی ہیں، پھر ہم محسوس کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی علۃ العلل ایسی موجود و کارفرما ہے جو ہمارے حدِ علم سے باہر ہے، تو حقیقتہً ہم ان خیالات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہوتے جو قدیم معتقدات کے بانیوں میں عمل کر رہے تھے۔ بیکن نے ٹھیک کہا ہے کہ

> "تھوڑا فلسفہ انسانی دماغ کو لامذہبی کی حد تک پست کر دیتا ہے، لیکن فلسفہ کا گہرا مطالعہ انسانی دماغ کو مذہب سے قریب تر لے آتا ہے۔"

اَب ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تمام اُمور کے اجتماع نے جن میں سے بعض کچھ اَثر ڈالتے ہیں اور بعض کچھ، ہمارے زمانہ کو دورِ انتشار بنا دیا ہے۔ جدید علوم کا قدیم معتقدات سے اِختلاف اور پھر اِتفاق، اور اس اِتفاق و اختلاف کا باہم اختلاط یہ ہے حقیقی وجہ اذہان و خیالات کے انتشار کی، اگر صرف اختلاف ہوتا

جب بھی صورتِ حال واضح ہوتی، بنی نوعِ انسان کا ذہن دیر یا سویر کسی نہ کسی طرح اختلاف کے بعد مجبور ہو جاتا کہ پرانے معتقدات کو خیرباد کہہ کر نئے عقائد گڑھ لے لیکن چونکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ اہم ترین، اور بہتم بالشان معاملات میں جدید علوم قدیم معتقدات کے ساتھ اتفاق کر رہے ہیں، اس لئے معاملہ اتنا آسان نہیں رہ جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم معتقدات اپنا زبردست اثر سارے جہان پر رکھتے ہیں، اور ہر مذہب اپنے ساتھ پختہ عقائد رکھنے والے پیرؤں کی ایک بڑی تعداد رکھتا ہے، جو اس سے بہت بلند ہیں کہ صرف ان اصول کو چھانٹ کر نکال لیں جن سے سائنس نے اتفاق کیا ہے، بلکہ ان کا اصرار ہے کہ معتقدات کے اس مجموعہ کو تمام و کمال بالکل اسی طرح قبول کر لیا جائے جیسا کہ وہ ابتداء سے ہے، اور یہ سچ بھی ہے کہ معتقدات کے ایک حصہ کی جدید علوم کے ذریعہ تصدیق خود اس بات کی مقتضی ہے کہ مجموعہ کی حفاظت کی جائے اور اُسے باقی رکھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجموعۂ اعتقادیات میں سے اگر کسی جزو کو بطور استناد چھوڑ دیا گیا تو لازماً دوسرے تمام اجزاء بطور استناد کالعدم ہو جاتے ہیں۔ ایک کلیہ ہے کہ کچھ چھوٹا تو سب کچھ چھوٹا۔ اس بناء پر قدیم معتقدات کے ان اجزاء کی جنھیں موجودہ علوم تسلیم نہیں کرتے شدت کے ساتھ حمایت کی جاتی ہے۔ آج بھی منظم کلیساؤں کی طرف سے معتقدات کا جو مجموعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اُس میں یہ اجزاء شامل ہوتے ہیں اور نتیجۃً ہمارے زمانہ کا انتشار دماغی شدید تر ہوتا رہتا ہے۔

ضرورت ہے کہ قدیم مذہبی معتقدات میں سے وسیع النظری کے ساتھ چھان بین کر کے اوہام کا حصہ نکال دیا جائے، یہی اوہام بنیاد ہیں اُن تمام

خرابیوں کی جو مذہب کے نام سے مختلف ممالک و مختلف ادوار میں پیدا کیجاتی رہی ہیں۔ بے سمجھے بوجھے اوہام کی پیروی سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ حد شمار سے باہر ہیں، یہی اوہام ہیں جن کی جدید علوم سے اکثر ٹکر ہوجاتی ہے۔ یہ اوہام مذہب کو ہماری عام زندگی سے الگ کر رہے ہیں، اور جدید دماغوں اور مذہبی حقیقی معتقدات کے مابین بھی عریض خلیج پیدا کرتے جاتے ہیں، سچ یہ ہے کہ یہ اوہام خود مذہب کو بھی زبردست نقصان پہنچانے کا باعث ہیں۔

رہا حقیقتاً مذہب، تو دنیائے انسانیت کو مذہب کی شدید ضرورت ہے، انسان جانوروں اور چوپایوں کی طرح صرف مادی وطبعی اطمینان پر زندگی نہیں بسر کرسکتا۔ اس کے لیئے روحانی سکینت کا سامان بھی ازبس ضروری ہے بلکہ روحانی جدوجہد انسان کے لئے ایک فطری امر ہے۔ یہ یقین کہ کائنات جسے ہم دیکھ رہے ہیں پوری طرح مکمل نہیں ہے، ہم میں ایک عظیم الشان ذہنی خلاء پیدا کر دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیساؤں کی طرف سے ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ بہت سی ناقابلِ اعتبار باتوں پر بھی ایمان لائیں، لیکن یہ سمجھ لینا کہ کچھ بھی قابلِ یقین نہیں، سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار بات ہوگی۔

مذہب ہر زمانہ میں اخلاق کی مضبوط چہار دیواری رہا ہے، مذہب بہ یک وقت عقیدہ بھی ہے اور نظم و ضبط بھی، یاد رکھو کہ مذہب رضامندانہ اخلاق بندی ہے، کہیں مذہب غایب ہوا تو اخلاق کی پوری عمارت خاک کا ڈھیر ہوکر رہ جائے گی۔

ذرا تھوڑی دیر کے لئے تصور تو کرو کہ تمام مذہبی تنظیمیں ختم کردی گئیں، تمام مذہبی عمارتوں کے دروازے بند کردیئے گئے، مذہبی رہنماؤں، اور مذہبی فرائض انجام دینے والوں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔ اس وقت انسانیت معنوی طور پر کتنی مفلس ہوجائے گی، یہ بڑے خزانے ہیں جو بانیان مذہب،

مقدس پیغمبر، مذہبی شعراء، اولیاء، اور فقراء کی زندگیوں کے ذریعہ ہمارے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ دنیا کے لئے قیمتی ورثہ ہے جو پچھلی نسلوں سے ہم کو ملا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لئے تباہی اور انتہائی محرومی ہوگی کہ اتنا گرانقدر خزانہ ضایع ہوجائے اور ہم اس سے محروم ہوجائیں۔

اس کے باوجود، اگر ہماری نظر اپنے ماحول کے حقیقی حالات پر ہے تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ دماغی رفتار اسی طرف (ترک مذہب) جا رہی ہے، اور خطرہ درپیش ہے نہ صرف کھلے دشمنان مذہب کی طرف سے بلکہ بعض سچے عقیدت کیش اور پکے مذہبی حضرات کی طرف سے بھی۔

ایک طرف یہ اصرار ہے کہ مذاہب مختلف غلط اور متروک اُمور کے حامل ہیں، خصوصاً متروک علم کائنات اور غلط علم النفس اُن میں پایا جاتا ہے، اس لئے انکو ختم ہوجانا چاہیئے، تو دوسری طرف مذہب کے حمایتی مصر ہیں کہ ہم تو ویسے ہی رہیں گے، جیسے ہیں۔

دنیا کے ہر حصہ میں بسنے والے کڑوروں مَردوں اور عورتوں کا فریضہ ہے کہ اب ان دو اُمور میں سے کسی ایک کو اختیار کریں، یا تو پرانے اوہام، اور فضول رسموں کو چھوڑ دیں یا پھر مذہب جیسی کارآمد، مفید اور بے بہا نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں —— لیکن یہ انتخاب کوئی آسان کام نہیں بچپن سے کچھ چیزیں ذہن و دماغ میں اس طرح مُرتسم ہوچکی ہیں کہ انھیں چھوڑنا اور نئی باتوں پر یقین کرلینا سہل نہیں معلوم ہوتا۔ ان چیزوں پر سے یقین و اعتقاد ہٹانا بڑا مشکل کام ہے اس لئے سخت دماغی اُلجھن پیدا ہوگئی ہے —— بہت سے تو صرف سلبی صورت کو اختیار کرلیتے ہیں، لیکن زیادہ وہ ہیں جو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے، اور ساری عمر ایک قسم کی دماغی بے چینی

اور ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو گھبرا کر کہتے ہیں کہ آجکل کوئی نہیں جانتا کہ کس بات پر یقین رکھے، اور کس پر نہیں۔

اس طرح موجودہ زمانہ کی دماغی رو صرف ظاہر پسندی کی طرف جا رہی ہے، لوگ بہت سی قدیم مذہبی رسمیں بے معنی سمجھ کر بھی انجام دے لیتے ہیں۔

یہ ہیں وہ حالات جن کی وجہ سے ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ قدیم مذہب کی گرفت اَب لوگوں پر باقی نہیں ہے۔ عام انسانی زندگی اور مذہب کے درمیان کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔ عصر حاضر کی گمراہی اور بے چینی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے۔

پانچواں باب

وجدان، علم باطن اور کرامات

وِجدان، علمِ باطن اور کرامات

یہ تو درست ہے کہ انسان ترقی کے ہر ممکن راستہ کی تلاش میں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ علوم جدیدہ کی تھکا دینے والی راہ کے علاوہ اور بھی کوئی راستہ ہے یا نہیں، نظریئے اور استدلالوں سے مختلف بھی کوئی راستہ ممکن ہے؟ محسوسات سے اخذ نتائج کو چھوڑ کر کیا ہم ایسی کسی سرحد میں پہنچ سکتے ہیں جہاں روح و دماغ کی براہ راست پرواز کارآمد ہو سکے؟ کیا علم باطن اور وجدان ہمیں وہاں نہیں پہنچا سکتا ہے جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں؟

بڑے بڑے مذاہب کے بانیوں اور تمام پیغمبروں نے خداوند تعالیٰ سے براہ راست تلقی علم کا دعویٰ کیا ہے۔ اسی طرح ہر اعتقاد کے فقراء اور اصحاب باطن بھی اس کے دعویدار رہیں، دنیا کے ہر حصہ میں ایسے فرقے موجود ہیں، عملی تجربے کئے گئے ہیں، اور اس امید کے ساتھ اب بھی کئے جاتے ہیں کہ انسان میں تجلی آسمانی کے حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

ہندوؤں میں یوگا قدیم اور عام طریقہ ہے، بودھ دھیان سے یہ کام لیتے ہیں مسلمانوں میں تصوف، یہودیوں میں اشراق (القبلہ) اور عیسائیوں میں علم باطن کی مختلف قسمیں موجود ہیں — ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہزاروں مرد و عورت اس کا یقین بھی رکھتے ہیں کہ اُن کا قیوم عالم سے براہ راست تعلق ہے۔ انہیں

بہت سے لوگ ہیں بتاتے ہیں کہ پیام ربانی عین سکوت کے عالم میں گفتگو کی آواز کی طرح آتا ہے، کبھی موسیقی کی طرح مبہم اور کبھی بالکل صاف آواز سنائی دیتی ہے، جو رہنمائی کرتی ہے، دعاؤں اور سوالات کا جواب دیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناقابل بیان نعمت یعنی نورِ ربانی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

اِس قوتِ باطن سے بہت ہی کم پیمانہ پر دماغ انسانی کا وہ معمولی عمل ہے جسے وجدان کہتے ہیں۔ یہ قوت جبلی سے کسی قدر مشابہ ہے۔ ماہر علم النفس قوت جبلی کے متعلق کہتا ہے کہ یہ بھی ایک تحت الشعوری کیفیت ہے۔ ایک معاصر مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"ہر جاندار جس میں اِنسان بھی داخل ہے دو قسم کی ذہنی کیفیت رکھتا ہے، ایک جبلی، اور اندر سے خود بخود پیدا ہونے والی، اور دوسری اَخذ کرنے والی، صورت کش اور محصلہ، یہ دونوں کیفیتیں ہمیشہ باہم مخلوط ہوتی ہیں، مدارج ارتقاء میں وہ محض تحدید کی حد تک تو جدا ہو سکتی ہیں، لیکن یہ دونوں ایک دوسری سے کبھی بالکلیہ علٰحدہ نہیں ہو سکتی ہیں۔ اِنسان اور کیڑے مکوڑے کے دماغ خاص طور پر ان ہی دونوں کیفیتوں کے مدارج ترقی میں باہم مختلف ہوتے ہیں...... ایک کیڑہ کا دماغ اگرچہ پوری طرح جبلت کے ماتحت ہوتا ہے، مگر اس میں اِستدلال کا بھی کسیقدر اثر پایا جاتا ہے...... اَسی طرح اِنسانی زندگی اگرچہ عقلی فیصلوں سے بھری پڑی ہے لیکن پھر بھی اندرونی طور پر جبلی کیفیت سے خالی نہیں"

حقیقت یہ ہے کہ وجدان تمام اِنسانی تخیلات اور اعمال کی بنیاد ہے، بچہ کی سعی حرکت اور سعی گفتگو ایک وجدانی عمل ہے۔ حفاظت خود اختیاری، بھوک،

جنسی تشوق وغیرہ تمام اُصولی تحرکات وجدانی ہوتے ہیں۔ یہی حال ہے جذبات ہمدردی کا جن سے اخلاقیات کی بنیاد پڑتی ہے، اور اسی طرح ہوتا ہے احساس جمال جس سے حُسن کاری پیدا ہوتی ہے۔

اس زمانہ کے مفکرین میں عام طور پر یہ ذہنیت پائی جاتی ہے کہ وجدان کا پایہ بڑھادیں اور فراست وتعقل کا مرتبہ گھٹادیں۔ یہ صورت کسی حد تک فرویڈ اور اس کے مکتب کی حالیہ نفسیاتی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ اور کسی حد تک نتشے، برگسان اور کروس کی فلسفیانہ تعلیمات بھی اس صورتِ حال کی ذمہ دار ہیں۔ —— جرمنی اور ایطالیہ کی سیاسی تحریکات نے جن کے خیالات مذکورہ تعلیمات سے ماخوذ ہیں، اس ذہنیت کو دنیائے عمل تک پہنچادیا ہے۔ آج کل ان تحریکوں نے واقعات کی صورت گری میں اس ذہنیت کو نہایت قوت کے ساتھ موثر کیفیت دیدی ہے۔ سیاسیات میں جو اہمیت انھیں حاصل ہوگئی ہے اس سے اُصول وجدان کو اور بھی غیر معمولی اعتبار حاصل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے چاروں طرف تعقل واستدلال سے برگشتگی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

یہ ایک ایسی موثر چیز ہے جو مذہب، اخلاق، اور سیاست، سب پر اثر انداز ہے، ضرورت ہے کہ ہم وقت نظر کے ساتھ اس کی تنقیح کریں:

کیا ہمارے معمولی وجدانی خیالات واعمال ہماری فطرت روحانی سے پیدا ہوتے ہیں؟ کیا عقل وفراست کے مقابلہ میں یہ زیادہ مستند قرار دیئے جاسکتے ہیں؟ اور کیا وہ اس ضمیر کے آثار ہیں جو قدرت نے ہم کو اس لئے ودیعت کیا ہے، کہ اگر ہم اس کی آواز پر کان دھریں تو وہ ہمارے لئے راہ صواب کی طرف بے خطا راہ بر ثابت ہو؟

یا یہ سب اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ عضویاتی حیات کے طویل ارتقاء سے

ہیں جو طبعی وراثت ملی ہے، یہ بھی اس کا ایک جزء ہے؟ اور حیات سادہ کی جبلت ہے جو ترقی پذیر اور وسیع صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ تعقل و فراست سے برتر نہیں بلکہ اس ارتقائی دور کی یادگار ہے جب کہ تعقل و فراست ابھی کام نہیں کر رہی تھی؟

عادتی وجدان سے آگے بڑھ کر جب ہم اس چیز تک پہنچتے ہیں جس کے باطنی کشف ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو مسئلہ بالکل دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے اگر یہ علم واقعتہً انسانیت سے برتر کوئی چیز ہے تو اس کے مستند قرار پانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی کشف اس کی طرف سے ہے جو ہمارے عالم محسوس سے باہر ہے یا یہ بھی ہمارے ہی خیالات ہیں جو خود ہمارے اندر سے پیدا ہو رہے ہیں، اور ان کی حیثیت دماغ کی ایک چال سے زیادہ نہیں، یا پھر یہ صورت ہے کہ بعض واقعتہً کشف ہوتا ہے اور بعض دماغ کی ستم ظریفی، اگر یہ صورت ہے تو پرکھنے کی ہمارے ہاتھ میں کیا تدبیر ہے؟

سائنس اس سے انکار نہیں کرتا کہ کسی انسان کو ماوراء عالم محسوس سے کوئی قابل استناد علم حاصل ہو، اس کو جب اپنی تسلیم کردہ دنیا سے متعلق کسی نظریہ کے قبول یا انکار کرنے میں تامل ہے تو سائنس کو کسی ایسے نظریہ کے قبول و انکار پر کہیں زیادہ تامل ہوگا جو اس کے حدود نظر سے باہر ہے۔

حقیقت ہے کہ مرتاض اور باطنی مشق کرنے والے حضرات کبھی کبھی عصبی مزاج کے لوگ ہوتے ہیں اور اکثر جب کہ ان کے بدن غیر معمولی حالت میں ہوتے ہیں اس وقت وہ بعض اثرات قبول کر لیتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ یہ اثرات سلبی ہوں یا ایجابی۔ ولیم جیمس جس نے بہت زیادہ اس عالم کو سائنس کی

نظریے سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اپنی کتاب "مذہبی تجربات کے تنوعات" میں لکھتا ہے کہ :-

" اگر عالم بالا کی طرف سے کشف کوئی چیز ہے تو اس کو حاصل کرنے کی صلاحیت عصبی مزاج سے بہتر طریقہ پر پیدا ہو سکتی ہے "

ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ :-

" جیسے ہمارا شعور ہمارے احساسات کو مادیات سے ربط کیلئے کھول دیتا ہے، بالکل اسی طرح منطقی طور پر یہ بھی قابل قبول ہے کہ بلند تر روحانی ذرایع موجود ہوں جو براہ راست ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، اُن کے لئے ہماری نفسیاتی حالت کافی ہو سکتی ہے کہ ہم ایک تحت الشعوری کیفیت بھی رکھتے ہیں اور صرف وہی کیفیت ان بلند تر روحانی ذرایع سے اثر پذیر ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا کہ بیداری کی پر شور زندگی میں ایک دروازہ بند ہو جاتا ہو، اور خواب کی سی ماورا، وجدانی کیفیت میں کھلے رہتے ہوں "

یا جیسا کہ برنارڈ شا نے اپنی کتاب " سینٹ جون " میں لکھا ہے، وہ کہتا ہے :

" جون ۔ میں ایسی آوازیں سنتا ہوں جو بتاتی ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، یہ آوازیں خدا کی طرف سے آتی ہیں "

" رابرٹ ۔ یہ آوازیں خود تمہارے تصورات کی دنیا سے آتی ہیں "

" جون ۔ بے شک، خدا کی آوازیں ہم تک کہاں آتی ہیں "

باہر سے قابل استناد پیام کے آنے کا امکان ناقابل انکار ہے، لیکن امکان اور واقعہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہمارے زمانہ میں جس باطنی طریقہ کا پوری توجہ توضیح اور پوری احتیاط کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے، وہ ہے ہندوستانی یوگ۔

جو شخص ہندوؤں کے علم باطن پر کوئی کتاب مطالعہ کرتا یا کوئی تقریر سنتا ہے، اس پر لازماً یہ اثر پڑتا ہے کہ اس طریقہ میں صداقت ہے، یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ یہ طریقہ باوجودیکہ اتنا قدیم ہے لیکن آج تک اتنی قوت رکھتا ہے، لیکن فوراً ہی شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کیا یہ طریقہ دعویٰ کے مطابق درحقیقت پردۂ احساسات کے پیچھے، وقت و فاصلہ کے حدود سے ماوراء کسی اندرونی مشاہدہ تک پہنچاتا ہے جو ایک ناقابلِ تشریح ربانی تعلق ہے، یا اس طریقہ سے بخار دماغی کے علاوہ کچھ نہیں پیدا ہوتا، یہ بخار قوس و قزح کی طرح چمکدار روشن، خوبصورت مگر خود اپنے ہی اندر سے پیدا شدہ ایک چیز ہوتی ہے جیسے خیالات، تصورات اور فصاحت لسانی سے ملا کر سب کچھ بنا دیا جاتا ہے۔ ہم اس طریقہ کی حقیقت تلاش کریں تو کیا ہمیں کچھ مل بھی سکتا ہے؟

ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب میں حسب ذیل جملہ ہے جس میں مخلوق و خدا کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ جملہ اکثر نقل کیا جاتا ہے۔

"باس کلی نے بدھوا سے پوچھا:۔ اے مقدس بزرگ مجھے برہما کی حقیقت سے آگاہ فرمایئے، موخرالذکر خاموش رہا۔ سائل نے اصرار کیا، جواب ملا میں تم کو بتا رہا ہوں مگر تم سمجھتے نہیں، خاموشی خود آتما ہے"

کیا یہ جواب زیادہ اثر انداز طریقہ پر صرف "ہم نہیں جانتے" سے زیادہ کچھ اور بھی ہے؟ ہندو علم باطن کے فاضل محقق پروفیسر عمانئل مرکالت کہتے ہیں:۔

"بعض یوگی خصوصاً ہتھا یوگی جن کے ساتھ میں نے ہندوستان میں کام کیا ہے، اپنے نفس کو دبا چکنے کے بعد لازمی طور پر خود

نفس سے بلند و ماورا کسی دوسری چیز تک نہیں پہنچے، اُن کے متعلق یہ میرے تاثرات ہیں۔"

لیکن پروفیسر مذکور کو،

"بڑی حد تک شخصی تجربات سے یقین ہے کہ راجا یوگی کا نفس کی سطح سے بلند مرتبہ تک ترقی کرنا ممکن ہے۔"

پروفیسر گرہام والس آنجہانی عام طور پر باطنی علوم کی دقیق تحقیقات سے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ ایسے تجربات اصولی طور پر ہپناٹزم اور خود اشاریت کے نتائج ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں، اور یقیناً خیالات میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن بہر حال ایک نقطہ ضرور ہے جس پر عام طور سے اتفاق ہے، وہ یہ کہ ہر دعویٔ الہام اور ربانی رابطہ کا ہر مدعی قابل تصدیق نہیں ہے، یہ کافی نہیں کہ علم باطن کی صداقت مسلم ہے، بلکہ اس شخص کی صداقت کا ثبوت ملنا چاہیئے جو ایسے علم کا دعویدار ہو۔

ولیم جیمس کہتا ہے:۔

"باطنی مشاہدات و تلقینات میں سے بعض تو تمام تر حماقت پر مبنی ہوتے ہیں، ہیبت سے پُر اور لرزہ براندام کرنے کی طاقت کے باوجود بعض اُن میں سے اخلاق و عمل کے لئے بالکل بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں، اُن میں کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی، ربانی و لاہوتی ہونا تو بڑی بات ہے، عیسائی علم باطن کی تاریخ میں اُن تلقینات و مکاشفات کو جو حقیقۃً خرق عادت کے طور پر عالم لاہوت سے حاصل ہوتے ہیں، اُن شیطانی تصرفات سے علیحدہ

وممتاز کرنے کا معاملہ ہمیشہ مشکل ترین مسئلہ رہا ہے، شیطان اپنے تصرفات کے ذریعہ دہوکا دے سکتا ہے، اور ایک دیندار آدمی کو ماقبل کی بہ نسبت دوگونہ قوت سے طفل جہنم کا مرتبہ عطا کرسکتا ہے، اس لئے کامل صاحب دل کی فہم وتجربہ کی ضرورت ان دونوں میں امتیاز کے لئے باقی رہ جاتی ہے۔"

تاریخ ایسے مدعیان نبوت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جو الہام ربانی کے پرزور دعاوی رکھتے تھے، لیکن اُن کے معاصرین اور ان کے مابعد آنیوالی نسلوں نے اُن کے کاذب اور جھوٹے مدعی نبوت ہونے کا فیصلہ کردیا، اُس کی وجہ صرف فریب نفس اور سادہ لوحی نہیں بلکہ بڑی حد تک دغابازی کا خیال خام اور مذہبی خبط بھی ہوتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جب میں فلسطین میں تھا مجھے معلوم ہوا کہ ایک نہیں بلکہ تین اشخاص نے وہاں اپنے عیسیٰ مسیح ہونے کا دعویٰ کردیا ہے، عام طور سے لوگ اس قسم کے دعاوی کے اتنے عادی ہوچکے تھے کہ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی؛

مندرجہ بالا امور کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر وجدانیات یا اندرونی مشاہدات کو بغیر کسی شرط کے مطلق سند مستند کے طور پر قبول کرلیا گیا تو اسکی ابتدائی صورت مستقل طور پر اپنی جگہ حاصل کرے گی، اور ہم اس ابتدائی دور مظاہر پرستی کی طرف لوٹ جائیں گے، جب کہ ہمیں ہر درخت میں ایک بھوت دریاؤں میں دیویاں، جنگلوں میں بھوتوں کے غول، اور چاند وسورج میں دیوی دیوتا نظر آتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خطرہ ہے کہ ہم قدیم دہشت انگیز دور تک پہنچ جائیں، مذہبی تصورات نے یونان کو اپالو اور ایتھن دیا تو مغربی ایشیا والوں کو مولوچ بھی عطاء فرمادیا، اور مایا کو آن کا خون آشام مذہب

بھی بخشا ہے۔

ڈاکٹر اوٹو اپنی مشہور کتاب "تصور تقدیس" میں لکھتے ہیں :-

"مذہب کی ابتدائی صورت خوفناک و خطرناک بلکہ بعض وقت اِنقلاب انگیز و باغیانہ ہوتی ہے۔ جس چیز کو موافق فطرت سمجھا جاتا ہے وہی بعد کو روز بروز نامناسب محسوس ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بالآخر اس کو یکدم ناکارہ قرار دینا پڑتا ہے"

لیکن سوال یہ ہے کہ جب وجدانی اِحساسات کو ایک بار بطور سند تسلیم کر لیا گیا تو کبھی اُسے ناقابل اِستناد قرار دیا جا سکے گا؟

کیا لوگوں کو پھر اس کے لئے کسی دوسرے کشف و وجدان کا اِنتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ کس طرح فیصلہ کیا جا سکے گا کہ جدید و قدیم میں سے کون قابل یقین ہے؟

ان تمام شکوک و شبہات میں ایک چیز بہرحال مسلم معلوم ہوتی ہے کہ کشف، وجدان، اور الہام کے دعاوی صرف اس لئے قبول نہیں کئے جا سکتے کہ "پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے"

یہی صورت ہوتی ہے اخلاقی حدود میں وجدان کی، اس وقت وجدان کو ہم لوگ ضمیر کی آواز بھی کہتے ہیں، مگر خود ضمیر بھی تو غلطی کر سکتا ہے۔

کہیں سے تاریخ عالم کے صفحات اُلٹیئے ایسے بہت سے کارنامے نظر آئیں گے جو عظیم الشان اشخاص نے ضمیر کی آواز کے ماتحت انجام دیئے تھے، لیکن زمانۂ مابعد نے بالاتفاق ان کارناموں کو اعلیٰ درجہ کا ظلم اور وحشت طرازی قرار دیا ہر ستم رانی ضمیر کی آواز ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ نیز یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کا ضمیر ایک حکم لگاتا ہے، اور دوسرے کا اُس کے بالکل برخلاف حکم دیتا ہے، ایک شخص ہے کہ ہمیشہ تا دمِ مرگ کسی قانون، یا ضابطہ کو اپنے ضمیر کے خلاف

پاکر اس کی مخالفت کرتا ہے لیکن اُس جیسے دوسرے بہت سے افراد اسی ضابطہ کو بدیہی طور پر حق بجانب سمجھتے اور قبول کر لیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ بنی نوع انسان میں ایک ہی ضمیر ہے جو ہر فردِ بشر میں کار فرما ہے، اور آزادی کے ساتھ خطا و صواب کی نشان دہی کرتا ہے تو لازماً ہر انسانی ذہن کی ایک ہی ساخت ہونی چاہیئے تھی، اور ہر مسئلہ پر یکساں جواب ذہنوں میں آنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی یکسانیت اور ایسا اتفاق کہیں موجود نہیں، نہ آج ہے، اور نہ کل موجود تھا۔ اِس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی شخص کا کسی فعل کے متعلق یہ یقین کہ اُسے کرنا چاہیئے یہ اُس کے ضمیر کا حکم ہے خود اُس فعل کے جواز کی کوئی دلیل ہے، ولیم جیمس نے کیا خوب کہا ہے:۔

> "علم باطن بہت زیادہ شخصی چیز ہے، پھر اس میں بہت تنوع بھی ہے، ممکن نہیں کہ اس کے متعلق کسی عمومی اِستناد کا دعوےٰ کیا جا سکے۔"

موجودہ دور جسے یقین کے لئے مستحکم بنیاد کی تلاش ہے کسی باطنی تجربہ یا کسی شخص کے ضمیر کی حکمرانی کو تسلیم کر کے یہ بنیاد نہیں پا سکتا۔ اِستناد کو قابل تنقیح، اور فیصلہ کو قابل تنقید ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ ہم ایسی بنیاد کہاں سے لائیں؟

کبھی ایسا زمانہ تھا کہ قوت خود معیار بن جاتی تھی، عقیدہ، نہ قبول کرنیوالوں کو کچل کر منوالیا جاتا تھا، اور جب ایک عقیدہ اس طرح مان لیا جاتا تو وہ عقیدہ ربانی قرار پاتا تھا، لیکن موجودہ دور میں تم منکرین کو قتل کرنا تو کجا چپ بھی نہیں کر سکتے ——— اب جب کہ قوموں کا باہمی ربط بہت زیادہ قوی ہوتا جا رہا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اِنکار جو کسی مقام پر کچل دینے کے قابل قرار پاتا ہے، وہی اِنکار

دوسرے مقام پر ایک عقیدہ بن کر دوسروں کو پھل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قوت دلیل صداقت نہیں ہو سکتی۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ عجائبات و خرق عادت سے دعوائے کشف کی تصدیق ہو جاتی تھی، یہ مُہر جس دعویٰ پر لگ گئی اُسے مصدقہ قرار دے کر مان لیا جاتا تھا۔

خرق عادت عموماً چار قسم کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِن چاروں اقسام کے اندر تمیز کرنا بڑا اہم کام ہے۔

(۱) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو فطرت کے عام مقرر کردہ ضابطہ سے بالکل مخالف ہو، مثلاً کوئی مادی چیز بدل کر دوسری چیز ہو جائے، اور اُن دونوں کے مابین کوئی کیمیاوی رابطہ موجود نہ ہو، جیسے بیل اور آم کا درخت، یا لکڑی اور سانپ۔ یا جیسے کوئی پتھر کا بت حرکت کرنے لگے یا گفتگو شروع کر دے۔

(۲) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو بہ ظاہر تو ضابطہ فطرت کے مخالف معلوم ہو، لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ مثلاً کسی مریض کا فوری جذبہ یا چوٹ کے ذریعہ یا کسی دوسرے شخص کے اثر کے ماتحت شفا پا جانا۔

(۳) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو اگرچہ ضابطۂ فطرت کے خلاف نہیں مگر اُس خاص وقت میں خلاف ضابطہ معلوم ہوتا ہو، مثلاً بارش کے لئے دعا کی گئی، اور فوراً بارش ہو گئی۔

(۴) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جس کا کوئی تعلق حدود عالم طبیعیات سے نہ ہو، مثلاً بیرون عالم مادہ سے تلقی علم یا ارواح کی حاضری وغیرہ۔

پہلی تینوں قسموں کے متعلق تو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈھ کر وجوہ و اسباب نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً قسم اول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کافی شہادت موجود نہیں

اور اگر ہو بھی تو یہ معمولی نظر بندی سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتا اکثر ایسے واقعات نظر کے دہوکے ہوتے ہیں۔ قسم دوم کے متعلق صورت بالکل واضح ہے ہاتھ پھیر دینے یا پھونک دینے سے کسی شخص کا صحت یاب ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں، مختلف جذبات پیدا کر کے نفسی علاج ہو سکتا ہے، مشہور ہے کہ "ایک گھنٹہ کی خوشی سو روپیہ کی دَوا سے بہتر ہے"۔ دوسرے انسان کی توت کا اَثر بھی پڑتا ہے، اور نفسیات میں یہ بار ہا کا تجربہ کیا ہوا مسئلہ ہے، قسم سوم کے متعلق جب تک یہ معلوم نہو کہ یہ واقعہ اتفاق تھا یا دعا رکا اثر، معاملہ واضح نہیں ہوتا۔ جب بار بار ایسا ہی واقعہ ظہور پذیر ہو تب البتہ اسے خرق عادت کہا جاسکیگا لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

اصل معاملہ چوتھی قسم کا رہ جاتا ہے۔ جو لوگ فطرت کے عام مقرر کردہ ضابطہ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُس میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ اِس پر طرح طرح کے شکوک وارد کرتے ہیں جن میں ناکافی شہادت، اور بیان کا ردوبدل وغیرہ داخل ہے، دیکھنے کی غلطی کو بھی ممکن قرار دیکر خرق عادت کو ختم کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاتما بدھ سب نے اپنے پیروؤں کو عجائبات سے متاثر ہو جانے اور خرق عادت کو دلیل صداقت کے طور پر قبول کرنے سے منع کیا ہے۔ اگر یہی وجہ صداقت کی ہو تو مداری کے تماشہ سے اس کی باتیں مبنی بر صداقت کیوں نہ قرار پائیں۔

وجدان کی صحت کے متعلق فیصلہ کن چیز کسی مذہبی مجلس کا بیان، یا کوئی مقدس کتاب بھی نہیں ہو سکتی، کسی مذہب کی مقدس کتاب کا ہر جزو موجودہ دنیا کے تمام اشخاص کے لیئے قابل قبول نہیں ہے۔ بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

کسی کلیسا کو مقام اِستناد اگر دیا جائے تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خود اِس کلیسا کی بنیاد کس چیز پر ہے، جواب میں وہی لفظ وجدان آجائے گا، نتیجۃً ہم منطقی دور میں مبتلا ہو جائیں گے، کلیسا کی بنیاد کشف و وجدان پر اور کشف و وجدان کی بنیاد کلیسا پر۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عام بنی نوع اِنسان کی رضامندی کو معیار قرار دیا جائے، ڈھونڈھ کر وہ نقطہ نکالیئے جس پر سب لوگ متفق ہو سکیں، اور اُس میں حقیقۃً خدا کی آواز بھی شامل ہو ـــــ چند سادہ اخلاقی تصورات کے علاوہ کوئی اُصول مذہب ایسا نہیں ہو سکتا جو بدھ مت اور کنفیوشیت کے لئے قابل قبول ہو حالانکہ دنیا کی ایک تہائی آبادی اُن ہی دونوں مذاہب کے پیرؤں پر مشتمل ہے؛ اور اگر ان دونوں کو خارج بھی کر دیجئے پھر بھی مسلمان، عیسائی، یہودی اور ہندو بنیادی اُمور میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں؛

بعض لوگ ایک حل یہ نکالتے ہیں کہ سائنس اور مذہب کے حدود ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ سائنس کے حدود میں اِستدلال و فراست کام کرتی ہے اور مذہب کے حدود میں وجدان و کشف، لیکن معمولی تحقیقات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔ سائنس دان کا دماغ بھی وجدان سے کام لیتا ہے اور مذہبی کا دماغ بھی استدلال و فراست سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

اِس پر بحث مفید نہیں کہ اِستدلال و وجدان میں سے اولیت کا مرتبہ کسے حاصل ہے، یہ کہنا کہ استدلال و فراست ہی اولی ہے، کمال درجہ نادانی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وجدان جو انسانی اعمال پر بڑی حد تک حکمرانی کرتا ہے محض خادم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح یہ کہنا بھی دانائی نہیں کہ "بالآخر وجدان ہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِستدلال و فراست سے غلطی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ غلطی ہوتی ہے، اس کی مثالیں اخلاق و سیاست کے معاملات میں بارہا ملتی ہیں، فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ اخلاق کے گہرے مطالعہ اور تاریخ کی چھان بین سے بار بار کلی اصول مرتب کئے جاتے ہیں، لیکن عمل میں آنے کے بعد یہ غلط اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں، البتہ ایک اُصولی فرق فراست و استدلال کی غلطی اور وجدان کی غلطی کے مابین ہے کہ فراست کی غلطی دوبارہ فراست کی تحقیقات میں ظاہر ہو جاتی ہے، اور اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ لیکن وجدان کی غلطی معلوم کرنے کا خود وجدان کے پاس کوئی راستہ نہیں، اس کی صرف ایک سبیل ہو سکتی ہے کہ وجدان کو اِستناد مطلق کے مرتبہ سے ہٹا دیا جائے اور فراست کو موقع دیا جائے کہ وجدان سے جو غلطی ہو چکی ہے، اُس کی اِصلاح کر دے، اِس طرح فراست و استدلال اخلاق، سیاست اور مذہب میں وجدان کی غلطیوں کو درست کر سکتا ہے؛

اب ہم اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں، سوال یہ تھا کہ سائنس کی تھکا دینے والی راہ کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، کیا ہم صداقت کاملہ تک وجدان و علم باطن کے پروں پر اُڑ کر نہیں جا سکتے، بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم مجبوراً یہ کہتے ہیں کہ وجدان و علم باطن کے ذریعہ کسی اچھے نتیجہ تک پہنچنے کی ہم اُمید نہیں کر سکتے۔ پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

وجدان اِنسانی دماغ کے اندرونی اعمال کا ایک جزء ہے، علم باطن اور الہام کا امکان ہے، سائنس کو اس سے اِنکار نہیں، لیکن الہام کا ہر دعویٰ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ضمیر کی آواز، اور وجدان کو قابل اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کھرے کھوٹے کی تمیز کے لئے کوئی فیصلہ کن چیز ہونی چاہیئے۔ یہ فیصلہ کن چیز کامیاب مظاہرۂ قوت یا خرق عادت کا ظہور نہیں ہو سکتا، خرق عادت میں سے بعض واقعات تو حقیقۃً خرق عادت نہیں ہوتے، اور جو واقعۃً خرق عادت کہے جا سکتے ہیں، اُن کے لئے

کافی شہادت موجود نہیں جو انکار پر غالب آ سکے، یہ فیصلہ کن چیز مجالس مذہبی یا مقدس کتب بھی نہیں ہو سکتی ہیں کیونکہ اول تو کسی مقدس کتاب پر اتفاق نہیں، دوسرے خود ان کی بنیاد بھی دعویٰ زیر بحث پر قایم ہے۔ یہ فیصلہ کن چیز تصدیق عام بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ تصدیق عام نہیں پائی جاتی، پھر کسی انکار کے مقابلہ میں عام تصدیق کیونکر پیش کی جا سکتی ہے، اگر کسی خاص وقت میں تصدیق عام بھی ہو جائے تو زمانہ مابعد کے لئے وہ سند نہیں رہتی۔

مذہب کو علوم طبعیہ سے بالکل علیحدہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، ایک کو وجدانیات اور دوسرے کو فراست سے متعلق کر کے ایک دوسرے سے بالکل جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کوئی وجہ ہے کہ وجدان کو فراست سے یا فراست کو وجدان سے بلند مرتبہ عطا کیا جائے —— ان دونوں میں ایک فرق البتہ موجود ہے وہ یہ کہ غلطی تو وجدان و فراست دونوں ہی سے ہو سکتی ہے لیکن فراست کی غلطی کی خود فراست ہی سے اصلاح بھی ہو سکتی ہے مگر وجدان کی غلطی کی اصلاح کی کوئی سبیل نہیں بجز اس کے کہ پھر فراست سے کام لیا جائے۔

چھٹا باب

مذہب کی معقولیت

مذہب کی معقولیت

ہر شخص جو دنیا میں امن و سکون کا آرزومند ہے اور چاہتا ہے کہ زمانہ کے انتشار سے نجات پانے کی کوئی راہ دریافت کرے اور یہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جدید علوم اور قدیم خیالات کے مابین اتفاق و اختلاف دونوں موجود ہیں، اُسے غور کرنا چاہیئے کہ وہ مذہب کو کیسا بنانا چاہتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لو کہ عقاید ناقابل تبدیل نہیں ہیں، ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، لیکن تغیر کس نوعیت کا ہو؟ ایک نسل آگے بڑھادیں، ایک صدی آگے بڑھادیں، آخر مذاہب کو ہم کہاں پہنچانا چاہتے ہیں؟

قدیم مذاہب مختلف قسم کے اجزا کا مجموعہ ہیں، اُن میں کائنات کی تشریح کر کے اس میں انسان کا مقام واضح کیا گیا ہے۔ اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا گیا ہے، پھر دلائل دئے گئے ہیں کہ کیوں ہمیں اس ضابطہ کی پیروی کرنی چاہیئے اس میں انسانی عواطف کے لئے راہ عطا کی گئی ہے، ان میں بیکسی کے عالم میں استعانت اور مصیبت کے وقت میں نجات کے لئے وسیلہ بتایا گیا ہے (ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کس طرح اپنے نیک خیالات کو قوی کر کے برے جذبات سے مقابلہ کر سکتا ہے) اور ان سب کے علاوہ ایک ایسے معبود کا تصور پیش کیا گیا ہے جو بہ یک وقت خالق بھی ہے، اور فعال مطلق بھی، جو قانون

دہندہ بھی ہے، اور عادل و منصف بھی، جو سرپرست بھی ہے اور حبیب بھی۔

علماء دینیات اس کے لئے تیار رہیں کہ خدا کی ذات اور اس کے افعال سے متعلق نہایت قابل اعتماد تفصیلات بتائیں، اس کی رضا یہ ہے، اس کا ارادہ یہ ہے، اس کے صفات یہ ہیں وغیرہ وغیرہ متی ارنلڈ کی زبان میں " جیسے خدا اگلی سڑک پر موجود کوئی شخص ہے " اگر تمام مذاہب یا ایک مذہب کی کتب مقدسہ کے تمام اجزاء کو ہم الہام تسلیم کر کے قبول کر لیں یا اولیاء و علماء باطن کے مشاہدات کو مان لیں، تو بلا شبہ اس قسم کی تفصیلات کے لئے گنجایش مل جاتی ہے۔ لیکن ہم ان سب کو بلا چون و چرا تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ایسا کرنے سے ہم تضاد میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور ہمیں ایسی باتیں ماننی پڑتی ہیں جو حقیقتاً صحیح نہیں ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ عقل و فراست کی رہنمائی میں ان مشاہدات اور کشوف کی تفصیلات میں انتخاب کا عمل کریں —— اب جیسے ہی ہم یہ عمل شروع کرتے ہیں، ہمیں ایسی آزاد دانش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو کسی خصوصی کشف و رؤیا کی پابند نہ ہو، اس وقت یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ہمارے وہ مقدمات معلومہ جن پر ایسے علم کی بنیاد ہوگی کتنے ناقص ہیں۔

اصول علت و معلول ہماری امید کا واحد مرکز ہے، اگر یہ کائنات معلول اور خدا علت ہے تو ذات علت اگرچہ پوری طرح نہیں لیکن بہرحال کسی قدر ذات معلول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ راگ سے مغنی پر، تصویر سے مصور پر فکر سے مفکر پر اور کائنات سے خالق کائنات پر ہم استدلال کر سکتے ہیں۔ اسپنوزا کہتا ہے کہ " جیسے جیسے ہم معلولات کو سمجھتے جائیں گے، خدا ہماری سمجھ میں آتا جائے گا " اور چونکہ کائنات میں عقل موجود ہے اس لئے خدا میں بھی یقیناً عقل ہونا چاہئیے۔

انسانی عقل، ارادہ و مقصد رکھتی ہے، اِس لئے یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ خالق کائنات بغیر اُن صفات کے ہوگا۔ یہ خیال کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ افعال فطرت کے پیچھے کوئی مقصد و ارادہ موجود نہیں ہے۔

کیا ہم اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اِنسانیت کی تاریخ اور موجودہ تہذیب میں ذات خداوندی سے متعلق کوئی اور تفصیل مل سکتی ہے؟

جو مفکرین اصول علت و معلول کو تسلیم کرتے ہیں، اور وجود خالق کو اوّلاً، اور عقل، ارادہ اور مقصد کو اس کے توابع کے طور پر مانتے ہیں، اُن میں خدا اور عالم کے باہمی تعلق سے متعلق چار قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

(۱) ایک وہ طبقہ ہے کہ جو خدا کو ایک تاریخی شخصیت مانتا ہے، ایک مرتبہ ماضی بعید میں خدا نے عالم کو پیدا کر دیا تھا، اس کے بعد خود عالم میں ایسے قوی موجود ہیں جو کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ دنیا کا کام چلتا رہتا ہے۔

(۲) ایک خیال یہ ہے کہ خدا نے فطرت کے قوانین مرتب فرما دیئے ہیں، اور دائماً فعّال و نگران بھی ہے کبھی کبھی وہ دُنیا کے معاملات میں دخل بھی دیتا ہے، اِس خیال کے لوگوں میں سے بعض کسی ایک پیغمبر یا متوسط کے ذریعہ فعالیت کو مانتے ہیں، بعض وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی متعدد برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ، اور بعض یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ فطرت کے قانون مستمرہ میں مخصوص و متواتر عمل ارادہ کے ذریعہ کار فرما ہے۔

(۳) تیسری جماعت وہ ہے جو کہتی ہے کہ خدا ہر وقت، ہر جگہ اور ہر چیز میں کار فرما ہے۔

(۴) چوتھی جماعت "ہمہ اوست" والوں کی ہے، ان کے نزدیک خدا اور کائنات کے مابین دُوئی نہیں ہے یہ لوگ خدا کو خارج میں تسلیم نہیں کرتے

اور یہ بھی نہیں مانتے کہ خدا اِس کائنات کے علاوہ کچھ اور ہے — جدید علوم میں اس کی مثال تلاش کیجئے تو یوں سمجھیئے کہ خدا اور اس عالم عقل و مادہ کے مابین تعلق ایسا ہے جیسے ایک ذی روح جسم اور کروڑوں خلیات میں ہے۔ ہر خلیہ انفرادیت رکھتی ہے لیکن پورے عضویاتی نظام سے کسب حیات کرتی ہے۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ دنیا کو دیکھ کر ہم خدا تک راہ حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، تو ہم ہر اس عمل کو جو ہمارے اس کرۂ ارضی پر وقوع پذیر ہوتا ہے خدا کا فعل سمجھ کر کہتے ہیں۔ اِس جھگڑے کو رہنے دو کہ خدا اور کائنات کا تعلق کس طرح کا ہے۔ تخلیق کائنات کے بعد خدا نے اپنے آپ کو بالکل الگ کر لیا ہے، یا خدا موجود ہے لیکن فعل کبھی کبھی اس سے صادر ہوتا ہے یا وہ ہر وقت وہر چیز میں ہر جگہ کارفرما ہے یا کائنات عین خدا ہے، چاروں صورتوں میں اِس پر بہرحال اتفاق ہے کہ اس ساری کائنات کا خالق مُطلق خدا ہی ہے۔ آخری اِختیار اُسی کا ہے، اور آخری اِختیار ناقابل تقسیم ہے کیونکہ کوئی دوسرا موجود نہیں جو اس کے اِختیارات میں شریک ہو۔ خدا یا تو سب اِختیار رکھتا ہے یا پھر کوئی اختیار نہیں رکھتا، اگر ایک بھی ایسا تسلیم کیا گیا جس کو کچھ اختیار حاصل ہو تو سب کو کچھ نہ کچھ اشتراک حاصل ہو جائے گا۔

اِس مسئلہ پر کون یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا چاروں خیالات میں سے واقعہ سے تطابق کس کا ہوتا ہے، اور کس کا نہیں ہوتا۔ یہی حال ہے انسانی رُوح کی حقیقت، اور اس کے لازوالی ہونے یا نہ ہونے کا مذہب کی دُنیا میں عدم یقین کی بڑی بہتات ہے۔ دلائل و براہین کے ساتھ مختلف خیالات کی بڑی گنجایش موجود ہے ہر اختلاف کسی نہ کسی مذہب میں مستند

قرار پا سکتا ہے۔

اُصول مذہب میں اتفاق کے باوجود پیش کرنے کے طریقہ میں اتنا اختلاف ہے کہ پوری دنیا ئے انسانیت کے لئے ایک مذہب تیار کرنا ممکن نہیں۔ یہ محض حماقت ہوگی کہ ایک معیاری مذہب کی تلاش کی جائے جس کے عقائد و اعمال سب کے لئے قابل قبول ہوں۔ مستقبل میں کبھی اگر عقائد میں تقرب پیدا ہو جائے پھر بھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ اختلافات بالکل ختم ہو جائیں گے۔

دوم:۔ کسی مذہب کے اثر انداز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جماعتی ہو، اس کا دستور اجتماعی ہونا چاہیئے جس میں فطرت کے اُصول کی گنجائش بھی موجود ہو، زیادہ لوگ وہی ہیں جو محتاج ہیں کہ کسی تنظیم کے ذریعہ اُن کے سامنے ایک نظام اعتقاد پیش کیا جائے، غیر معمولی مفکر اپنے عقائد خود ہی بنا سکتا ہے، وہ کلیساؤں کے احکام کی پیروی بھی کر سکتا ہے اور ایک جدید کلیسا بنا بھی سکتا ہے۔ لیکن تہذیب کے موجودہ درجہ میں ـــــ ایک معمولی آدمی محدود معلومات اور فرائض معاش کے دباؤ میں کہاں بنا سکتا ہے۔

ہزاروں مرد اور اُن سے زیادہ عورتیں نمازوں میں اطمینان قلب محسوس کرتی ہیں، اگرچہ ایک ملحد کو یہ نمازیں خود اشاریت سے زیادہ کچھ نہ نظر آتی ہوں لیکن اس کا ہر شخص اقرار کرے گا کہ عبادت کرنے والے کے لئے یہ نمازیں ذہن کو نیکی کی طرف پھیر دینے والی چیزیں ہیں۔

سوم:۔ مذہب کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جذبات کی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی راہ دے۔ مذہب شعر کو روح انسانی کی خدمت کے لئے اختیار کرتا ہے، شعر مذہب کے لئے روایات کا ایک جال بن کر تیار کرتا ہے، مظاہر بناتا اور رسوم و اعمال مذہبی کی طرف رجحان پیدا کرتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو فنِ تعمیر

موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی امداد کرتا ہے ــــ مذہب زمانہ ماضی میں اپنی پاک زندگیاں بسر کرنے والے پیغمبروں، ولیوں، اور شہداء سے ہمارا ربط قایم رکھتا ہے، ان بزرگ لوگوں سے ہماری ملاقات کراتا ہے جنھوں نے رُوحانی اُمور کی تکمیل کے لیئے اپنی جانیں تک قربان کر دی تھیں، اِس طرح مذہب ہمیں ہزار ہا سال کی روایات سے جو اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، اُس کے ماتحت لے آتا ہے۔ ہمارے حاضر کو شاندار ماضی سے اور مستقبل کو ہمارے حاضر سے جوڑ کر مذہب انسانیت کی تاریخ میں ایک ربط پیدا کر دیتا ہے۔ عشار ربانی جس میں بار بار شعر آتا رہتا ہے زندگی کے معمولی واردات مثلاً محبت، شفقت، ولادت، وفات وغیرہ میں شکوہ، اور قلوب کو سکینت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی فلسفہ مذہب نہیں بن سکا۔ فلسفہ نصب العین ویقین کی طرف رہنمائی تو کر سکتا ہے، لیکن خود نہ یقین بن سکتا ہے اور نہ نصب العین، کیا خوب کہا گیا ہے کہ:ـــ

"فلسفہ کی فنی اصطلاحات انسانی جذبات کو چھیڑنے میں بالکل ناکام ہیں اُن کی آواز ہماری رُوح کی دُنیا تک نہیں پہنچتی، اور نہ کوئی گونج پیدا ہوتی ہے ــــ فلسفہ ذہنی تصورات سے زیادہ کوئی زندہ خیال نہیں پیدا کرتا۔"

ایک فلسفی کے نزدیک یہ کائنات اور یہ سطح انسان کا ماحول ہے اور بس؛ لیکن ایک عام آدمی کے لیئے اس کا ماحول ہی اس کا گھر ہے، اس کا خاندان ہے، اس کا شہر ہے، اس کا ملک ہے، اور اس کی دُنیا ہے۔

فلسفہ شعر نہیں ہے، یا یوں سمجھئے کہ فلسفہ کو شعر نہیں ہونا چاہیئے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ بہت سے فلسفیوں کو اپنے فلسفیانہ نظریوں کے دلفریب بنانے کیلئے

اُس میں شعریت پیدا کرنے کی تمنا رہی ہے، اور بہت سے فلسفیوں نے اِس تمنا، کو پورا کرنے کی سعی بھی کی ہے، سب سے قدیم افلاطون، اور سب سے جدید برگسان کا نام اِس سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی فلسفہ، فلسفہ ہے اور شعر، شعر، ـــــ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کی نظر فلسفی کی نظر سے زیادہ عمیق ہوتی ہے، اور بعض وقت واقعی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اِن دونوں کے حدود نظر کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہی رہنا چاہیئے۔

شعر ذہنی مواد سے شاندار و دلفریب ڈھانچہ تیار کر سکتا ہے۔ فلسفہ نہیں کر سکتا اُس کے لئے مواد کا ٹھوس ہونا ضروری ہے، اس کو مشاہدہ، سائنس اور فراست کی حاجت ہے۔

اسی طرح شعر کا مقابلہ سائنس سے کیجئے، وہ اِحساس جو سائنس دان کو حرکت میں لاتا ہے، ممکن ہے کہ کسی معنی میں شاعرانہ اِحساس کہا جا سکے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سائنس کے اکتشافات میں شاعری کے لئے کوئی سامان میسر آجائے لیکن پھر بھی شعر سائنس نہیں ہے اور سائنس شعر نہیں ہے۔

شعر ہم سے فلسفہ و سائنس کی دُنیا میں جُدا ہو کر مذہب کی دنیا میں دوبارہ مِل جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو۔

مذہب اَولاً متنوع ہے، دوم ہم آہنگ ہے، سوم جذبات پرور اور شعریت سے پُر ہے تو پھر قدیم عقائد سے اختلاف کہاں ہوا؟

میں یہ پہلے بتا آیا ہوں کہ دعوائے کشف کی تنقیح میں فراست سے کام لینا چاہیئے اوہام کو مذہب بنا کر قبول کر لینا صحیح نہیں ہے، شعریت اپنی موثر قوت کے باوجود علم کی تباہی کا سبب نہ بننے پائے۔ ایک صحیح ذہن کبھی خلاف واقعہ امر کو یقینیات میں جگہ نہیں دے سکتا۔ صداقت کو بہرحال اول درجہ پر ہونا چاہیئے۔ اگر یہ سب کچھ

کیا گیا تو بہت کچھ اختلاف پیدا ہو جائے گا۔

ابتدائے کائنات سے متعلق وہ روایات جو آج مختلف مذاہب میں موجود ہیں، اُن میں سے موجودہ علوم کے نزدیک جو بالکل ناقابل قبول ہیں، آئندہ باقی نہ رہ سکیں گی خرق عادت اور کشف و کرامات کو وہ درجے نہیں دیئے جائیں گے جو آج دیئے جاتے ہیں. مختلف مذاہب میں جو علم الاصنام اور افسانے پائے جاتے ہیں، اُن کو صرف دیومالا اور افسانے ہی سمجھا جائے گا۔ آج کی طرح آواگون اور تناسخ کا چکر باقی نہیں رہیگا۔ یہ طریقہ جاری نہ رہ سکے گا کہ سادہ مزاج لوگوں کو دیومالا سُنا کر اُس پر یقین رکھنے کو کہا جائے۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ مذاہب ناقابل تبدیل نہیں ہیں۔ بہ ظاہر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سے عقائد میں بغیر اُن کی رُوح کو نقصان پہنچائے بھی مناسب ترمیم ہو سکتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ تمام مذاہب میں ضروریات زمانہ کے مطابق ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں، اگرچہ یہ ترمیمیں اُصول میں نہ ہوں مگر فروع اور اعمال میں یہ ترمیمیں ہوتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب میں آج بھی ایسی ترمیمیں جاری ہیں۔

اِن ترمیموں کے بعد یہ موقع نہیں رہے گا کہ محض اوہام کی بناء پر اَخلاق اِنسانی کی ترقی رُک جائے۔ یا دین کے نام سے پیشہ ور مذہبی جماعتیں برسرِ اقتدار نظر آئیں اور معاشرتی ترقی میں حارج ہوں۔ مذہب اس وقت اِنسان کے لئے افیون نہیں بلکہ ایک مقوی دوا ہوگا۔ اس وقت مذہب کو ایک تاریخی چیز نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت سمجھا جائے گا —— تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے والے ختم

ہو جائیں گے، بنی نوع انسان کو عظمت و سربلندی حاصل ہوگی، اِس وقت اِنسان دنیا میں قدرت کے نظام العمل کی تکمیل کو دیکھنے والا ہی نہیں ہوگا بلکہ قدرت کا نظام العمل خود اسی کے ہاتھوں سے تکمیل پائے گا ــــ مذہب آج کی طرح روزانہ کی زندگی سے غیر متعلق چیز نہ ہوگا، بلکہ ہر انسانی گھر، اور حکومت میں بھی پھر سے واپس آجائیگا۔

جب مذہب اوہام، و تصورات اور ممتنعات کا مجموعہ نہ ہوگا، بلکہ خود سائنس و فلسفہ کی طرح عقل و استدلال سے کام لیتا ہوگا تو ہمارے خیالات بھی مذہب کے مخالف نہ ہوں گے۔ اُس وقت کرسوپ لیک کی زبان میں "مذہب کسی محقق کے ذہن سے اُلجھے بغیر عابد کے قلب کو سکینت عطا کر سکے گا"

خود مذاہب کے مابین جو ایک رواداری پیدا ہو جائے گی وہ بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتی، تمام مذاہب کی ایک ہی راہ اور ایک ہی مقصد ہوگا۔ مذاہب ایک دوسرے سے اچھے اجزاء قبول کر سکیں گے، اور ان میں باہمی دشمنی کی بجائے اتحاد زیادہ کام کرے گا۔ [۱]

---

[۱] فاضل مصنف کا مطالعہ مذاہب چونکہ بڑی حد تک ناقص ہے، اس لئے جب وہ مذاہب کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اس وقت اُن کے اپنے مذہب یا بر اعظم یورپ کے عمومی مذہب، عیسائیت کا نقشہ سامنے رہتا ہے۔ معقولیت اور عقلی ترمیم سے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ یقیناً مذہب عیسائیت کے لئے ضروری ہوگا، کیونکہ عیسائیت خرافی روایات، اوہام، رسوم اور کشف ربانی کے تصص سے پر ہے، مذہبی ادارے ہیں جو اختیارات کلی کے ساتھ کارفرما ہیں۔ پرنیسٹ ہوڈ (مذہبی مقتدر طبقہ کا وجود) عیسائیت اور ہندو دھرم وغیرہ کی جان ہیں۔ اِس طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جو عقیدہ چاہے یقین کرلے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ پیش کردے اور جس پرانے عقیدہ کی چاہے من مانی تشریح و تفصیل بیان کردے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علوم عقلیہ اور جدید تجربات سے ٹکر ہو جاتی ہے۔

ہر دانشمند آدمی کو یہ تسلیم ہے کہ مجرد دعوائے کشف و الہام قابل قبول نہیں ہو سکتا، اور مسلمان صوفیاء کا تو اس پر اتفاق ہے کہ کشف و الہام باطن قابل استناد نہیں ہیں، کسی وقت اسے بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا یہ بھی صحیح ہے کہ خرق عادت و عجائبات سے مرعوب ہو جانے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ کسی مذہب کے فروع ناقابل تبدل ہوں تو ہوں، اسلام نے اس بارے میں جس قدر گنجایش فکر انسانی کے لئے رکھی ہے اس کے لئے فقہا و محققین کے فتاویٰ شاہد ہیں۔ مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں علم کلام کی پیدایش ہی اسی وسعت کی رہین منت ہے۔ علوم جدیدہ سے اسلام کی کہیں ٹکر نہیں ہوتی، اگرچہ ہم اس اصول کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ جو کچھ جدید عصری اکتشافات کے سامنے ناقابل قبول ٹھہرے اسے ٹھکرا دیا جائے۔ خود مصنف بھی چوتھے باب میں ثابت کر آئے ہیں کہ انسانی علوم ابھی تک اس قدر ناقص ہیں، اور ہر نظریہ اس قدر غیر یقینی ہے کہ اس کو ہم کسی یقین کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے، ملاحظہ ہو باب چہارم۔ لیکن پھر بھی یہ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے انسانی عقل و بصیرت کے لئے پرواز کی پوری وسعت مہیا کی ہے۔ اس نے کسی ایسی چیز کے ماننے کا حکم نہیں دیا جو عقل انسانی کے نزدیک صریحاً ناقابل قبول قرار پائے۔ عقل و فہم میں معیار کس کی عقل و فہم ہے؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ لیکن اسلام نے تو انفرادی فہم و ادراک کو بھی غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ضروریات و حالات زمانہ کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ ساتھ دیتا رہے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فاضل مصنف نے مذہب کی تشکیل جدید کے بعد جو اس کی خیالی صورت پیش کی ہے، اسلام کی آج بھی وہی صورت ہے اور وہی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتا ہے جس کی مصنف کو آرزو ہے۔ مثلاً ابتداء کائنات سے متعلق جو روایتیں جدید علوم کے نزدیک ناقابل قبول ہیں وہ باقی نہ رہیں گی۔ اسلام میں کوئی روایت ابتداء کائنات کے متعلق ایسی موجود نہیں۔ خرق عادت اور کشف وکرامات کو استناد کا مرتبہ نہ عطا کیا جائے ـــ اسلام میں خرق عادت، کشف وکرامات تو الگ رہا خود معجزہ کو بھی دلیل نبوت نہیں قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ عجائب سے متاثر نہ ہونے کا حکم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، جیسا کہ خود مصنف اسی باب میں بیان کر چکے ہیں ـــ اسلام میں "دیومالا" علم الاصنام کا وجود نہیں، عقیدۂ تناسخ اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام میں اوہام ورسوم کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بعض دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں رواج کو اہمیت حاصل نہیں ہے، اور نہ عقلی استدلال کو حرام قرار دے کر اوہام کی اتباع کا حکم ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جس میں انفرادی، عائلی، اور اجتماعی زندگی سب کا نقشہ موجود ہے، عیسائیت کی طرح قوانین سیاست اور ضوابط معاملات سے خالی نہیں ہے، اسلام نے انسان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ مصنف کی تمنا کے مطابق تقدیر خداوندی خود اسی کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(اقبال رح)

آخری فائدہ جو مصنف کو اپنے جدید مرحمہ مذہب میں نظر آتا ہے وہ مذاہب کی باہمی رواداری ہے۔ یورپ والوں کے ہاں رواداری نام ہے منافقت اور بے اصولی کا، اور اسلام میں رواداری نام ہے آزادی عمل عطا کرنے کا، اس دوسرے معنی میں دیکھئے تو کسی خالص اسلامی آبادی میں ایک فرد عیسائی بھی اپنے مذہب کے تمام فرائض انجام

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دے سکتا ہے، اور اسلامی ماحول میں آ سے وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے جو کسی دوسرے فرد مسلمان کو وہاں حاصل ہوں، عراق کی پارلیمان کے ایک عیسائی ممبر نے ۱۹۳۶ء میں تقریر کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ دنیا میں کسی قوم کا سینہ مسلمانوں کے سینہ سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا، پچھلے تیرہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے۔ لیکن رواداری کا دوسرا مفہوم جو یورپ والوں کے سامنے ہے یہ ہے کہ انسان دنیا کے تمام مروجہ مذاہب کو حق و صداقت کا حامل سمجھ لے، اور اُن کے اعمال و افکار میں شریک ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی بے اصول، جاہل و بے مقصد انسان ہی سے یہ ممکن ہے۔ سچا اشتراکی سرمایہ دار کے ہاں تقریب مسرت میں بھی شرکت گوارا نہیں کر سکتا، تو ایک سچا مسلمان دیوالی، یا کرسمس میں شرکت کیونکر گوارا کر سکتا ہے؛ مذاہب کا آپس میں ایک دوسرے سے اچھی باتیں اخذ کرنا، یقیناً اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ تاریخ ادیان کا گہرا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ دین پہلے وطنی تھا، جیسے مصریوں کا دین، ہندوستانیوں کا دین، بابلیوں کا دین وغیرہ، اس کے بعد نسلی ہوا جیسے یہودیوں کا دین، اور زرتشتیوں کا دین، پھر اسے پرائیوٹ یا نجی بنا دیا گیا جیسے عیسائی مذہب کی وہ شکل جو پولوس اعظم اور دوسرے بزرگان مسیحیت کے کشوف والہامات کی آمیزش کے بعد تیار ہوئی ہے۔ آخر میں دین خالص انسانی یا بنی نوع انسانی کا ہو گیا، جو نہ کسی وطن کے ساتھ مخصوص ہے۔ نہ نسل کے ساتھ اور نہ ایک شخص کا انفرادی معاملہ ہے، غور کر کے دیکھئے تمام پرانے مذاہب کی خوبیاں اس میں اکٹھا کر دی گئی ہیں، اس میں مصری، ہندوستانی، یہودی عیسائی اور زرتشتی مذاہب کی تمام اخلاقی خوبیاں مل جائیں گی۔

ہم مسلمان ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   اُمتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایمان ہو گئیں

بہر حال! اگر مصنف کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اور ہمارا ایقان ہے کہ ایک دن ہو گا۔

کہ تمام مذاہب کے ماننے والے عقل و فراست کو کام میں لاکر اپنے اپنے عقاید میں مناسب ترمیم کریں گے تو اُس دن ایک عالمگیر اتحاد قایم ہو جائے گا کیونکہ آخری ترمیم کے بعد ان کے عقاید و اعمال عین اسلام کے عقاید و اعمال ہو جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کے قول کے مطابق توحید ہو گی، دیو مالا ختم ہو جائے گی، اوہام ختم ہو جائیں گے، خدا کو مع صفات کے مانا جائے گا، عابد کو مذہب سکینت بخشے گا، اور مُحقق کے ذہن سے نہ اُلجھے گا۔ تناسخ کا چکر ختم ہو جائے گا مذہب کے ٹھیکہ دار ادارے ختم ہو جائیں گے، پیشہ ور مذہبی جماعت نہ ہو گی، معاشرتی اور علمی ترقی میں مذہب حارج نہ ہوگا، صداقت کو سب سے اعلیٰ درجہ عطا کیا جائے گا۔ مذہب افراد اور حکومت دونوں پر حاوی ہوگا ——— تو آخر اسلام اور کس نظام کا نام ہے؟ لے دے کے اقرار رسالت رہ جاتا ہے، تو سارے اقوال کو صداقت پر مبنی اور حق باور کرنے کے بعد کوئی حواس باختہ ہی ہو گا جو ان اقوال کے کہنے والے کو سچا نہ باور کرے۔

(ہاشمی)

ساتواں باب

شعر و مصائب

شر اور مصائب

ہمارے دماغ میں یہ سوال آیا کہ کیا ہم انسانی تجربات کی روشنی میں خدا کا کسی قدر تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن معاً یہ سوال بھی پیدا ہو گیا کہ ساری دنیا، اور ہر عہد کے انسانوں کے دل و دماغ کو جس مسئلہ نے تباہ کر رکھا ہے وہ ہے مصائب اور شر کے وجود کا مسئلہ۔ یہ ایک قدیم سوال ہے۔

ہم اکثر دیکھتے رہتے ہیں کہ نیکوکار اشخاص مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر خدا واقعی عادل ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خود انسانوں کے اندر نیکیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ اللہ کی رحمت ہے، لیکن یہ برائیاں کہاں سے آجاتی ہیں، کیا یہ خدا کی عداوت ہے، یا دوسرے لفظوں میں خدا کی غفلت ہے؟

ذہن انسانی کی اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی کہ اس میں قدرت کا ایک راز پنہاں ہے، جو ہمارے علم سے باہر ہے اس لئے عقیدت کے ماتحت اسے قبول کر لینا چاہیئے —— بہت سے لوگوں کی اسے بھی تشفی نہیں ہوتی کہ دنیا کی ہر مصیبت آسمانی راحت کے اضافہ کا باعث ہے، اس مصیبت سے کئی گونہ زیادہ مسرت اسکے بدلے میں ملے گی —— اس سوال کو خدا کے خالق خیر و شر دونوں ہونے سے انکار کر کے بھی ٹالا نہیں جا سکتا، بالکلیہ اختیار و تمام تر تخلیق کو اسی سے منسوب کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی دوسرا تلاش کرنے پر نہیں مل سکتا جو اس کے مقابلہ میں

رکھا جائے اور شریک قرار دیا جاسکے، اور کہا جاسکے کہ خیر کا خالق تو اللہ ہے اور شر کا خالق شیطان"۔

آج عقل و دانش کے اس زمانہ میں بھی حیرت انگیز ثنویت کی تبلیغ کی جاتی ہے ڈاکٹر ونگٹن انگرام بشپ لندن نے ۱۹۱۶ئہ میں پچھلی جنگ عظیم سے متعلق ایک پیام ربانی سناتے ہوئے فرمایا تھا۔

"تمہیں خدا کو الزام دینے کا کوئی حق نہیں، یہ سب کچھ شیطان کے کرتوت ہیں خدا ہر وقت شیطان اور اُس کے کرتوت سے ضیق میں رہتا ہے، اس لئے تم ہمارے خدا کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اُس کا بنا ہوا نقشہ ناکام رہا"

یہ صریح ثنویت اور شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن عقل کے نزدیک شرک و ثنویت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا قادر مطلق ہے اور وہی خیر و شر دونوں کا خالق ہے"۔

دہی طاقتوں کا مقابلہ کرنے والے بہادر، عبرانی پیغمبروں نے اس سوال کا معقولیت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں کیا تھا۔

"عموس نے سوال کیا کیا کسی شہر پر ایسی آفت بھی آتی ہے، جسے خدا نے نہ بھیجا ہو"

"حضرت یسع علیہ نے جواب دیا"

"میں نور کو بناتا، اور ظلمت کو پیدا کرتا ہوں۔ میں ہی قادر مطلق ہوں تو یہ سب کام کرتا ہے"

"میں نے ہی آہنگر کو پیدا کیا جو کوئلہ سے آگ جلاتا اور اپنے کام کے لئے اوزار بناتا ہے اور میں ہی نے اُس کو بھی پیدا کیا جو اُس کو تباہ کر دیتا ہے"

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں شر کا وجود ہی نہیں، یہ کہہ دینے سے رہائی نہیں ملتی، اس عریض و طویل دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک

چلے جاؤ، ہر جگہ تم کو دکھائی دے گا کہ شر موجود ہے اور لوگ مصائب جھیل رہے ہیں کہیں زلزلہ نے شہر کے شہر کو بے قصور باشندوں سمیت تباہ کر دیا ہے، اور کہیں طوفان باراں نے، کہیں سیلاب آگیا ہے، اور کہیں قحط نے تباہی پھیلا دی ہے ایک جگہ تم دیکھو گے کہ کوئی مرد حادثۂ اتفاقی کا شکار ہو کر دم توڑ رہا ہے تو دوسری جگہ کوئی عورت دردناک مرض میں مبتلا ہو کر جان دے رہی ہے، کسی جگہ جوان لاعلاج مرض میں گرفتار نظر آئے گا، اور کسی جگہ بچہ پیدائشی طور پر توریثی نقص کا شکار دکھائی دے گا۔ ان کے علاوہ ہر جگہ تم کو انسانیت سے گری ہوئی حرکات کے مجروحین بھی دکھائی دیں گے، یہ وہ ہیں جن کے سروں پر جنگ کی چکی، جرائم کی تلواریں، گناہوں کے آرے، اور معاشرتی نا انصافیوں کے خنجر چلتے ہیں —— جو کوئی جب یہ کہتا ہے کہ "شر کا وجود نہیں" تو یوں سمجھو کہ وہ ایک خلاف حقیقت مبالغہ سے کام لیتا ہے، یا شاید اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ شر کے مقابلہ کے لئے اپنے کو اس قدر شدت کے ساتھ تیار کرو کہ تم میں شر کے وجود ہی سے بے پروائی کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ یہ تو کسی طرح صحیح نہیں کہ "دنیا میں شر کا وجود نہیں ہے"

بہر حال! ہمیں اس مسئلہ پر کسی اور طرح سے غور کرنا پڑے گا۔ شر کے وجود سے انکار کر کے ہمیں چھٹکارا نہیں ملتا اور نہ اس میں ایک راز ہے کہ کہ ہم موجودہ اذہان کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

پہلے ان تین مقدمات کو ذہن نشین کر لو:

اوّل:۔ دنیا میں زندگی ہے، اور اس کرۂ ارضی کے محدود رقبہ میں زندگی کو پھلنا اور پھولنا ہے۔

دوم:۔ زندگی کوئی جامد شے نہیں جو بالکل اپنی مکمل شکل میں ابتدا ہی سے بنا کر بھیجدی گئی ہو، بلکہ زندگی میں سلسلۂ ارتقا جاری ہے۔

سوم :- ذی رُوح کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی اِس حد کے اندر جو اُس کے ماحول اور اُس کی فطرت نے مہیا کیا ہے، عقل و ادراک رکھتا ہے کسی قدر تمیز کی قوت بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنی عافیت کا ذمہ دار بھی ہے۔

جب تم یہ تسلیم کر چکے کہ مذکورۂ بالا مقدمات میں جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اُسکے مطابق ایک دُنیا موجود ہے تو چند لوازم سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔

تمیز کی قوت کے ساتھ ہی غلطی کا اِمکان بھی ضروری ہے، اگر یہ اِمکان نہ ہو تو تمیز کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ اور غلطی کے ساتھ اُس کا خمیازہ بھی ضرور ہوگا، کیونکہ یہ غلطی کا لازمی نتیجہ ہے ——— اِس کے بعد غور کرو کہ اگر انسان اپنی عافیت کا براہ راست ذمہ دار ہے تو اُسے عافیت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے والے اعمال اور عافیت کو ختم کر دینے اور نقصان پہنچانے والے اعمال کے مابین تمیز کرنا چاہئیے اَب اگر کسی وجہ سے اِنسان اِس تمیز میں غلطی کرتا، اور غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے تو لازمی نتیجہ کے طور پر اُس کی عافیت میں خلل پڑ جاتا ہے، چاہے یہ غلط فیصلہ فردِ واحد کا ہو، ایک طبقہ کا ہو یا پوری قوم کا۔ جب اِس طرح لوگوں کی عافیت میں خلل پڑ جاتا ہے تو شکایت کرتے ہیں کہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہے، حالانکہ آزادیِ عمل سے لطف اندوز ہونا مصیبت کے اِمکان کو مقتضی ہے۔

مذکورۂ بالا مقدمات کی روشنی میں موت پر غور کرو، اگر یہ ضروری کہ پیدائش ہو تو موت بھی ضروری ہے، اگر دُنیا سے رخصت ہونے کا سلسلہ بند ہو جائے تو دُنیا میں آنے کا سلسلہ لازماً بند ہو جائے گا، تھوڑے ہی دنوں میں زمین کا محدود رقبہ بھر جائے گا۔ اور آنے والے کے لئے جگہ باقی نہ رہے گی۔ ہم فرضی طور پر ایک ایسے عالم کا تصور تو کر سکتے ہیں جس میں ولادت و وفات دونوں نہ ہوں، لیکن ایسے عالم کا تصور ممکن بھی نہیں جس میں ان دونوں میں ایک ہو اور دوسری نہ ہو۔

ذرا اُس تصور ہی عالم پر غور کرو جس میں ولادت وفات دونوں نہ ہو، کیا وہ عالم جمادات کی دُنیا سے زیادہ کچھ ہوگا جس میں نہ جگہ خالی ہوتی ہوگی، اور نہ جا پڑی؟ حق یہ ہے کہ وہ اِرتقائی نقشہ جو دراصل اس پورے عضویاتی نظام کی رُوح ہے اِس بات کا مقتضی ہے کہ اَفراد مرتے رہیں اور دوسرے اُن کی جگہ لیتے رہیں، نسلیں ختم ہوتی رہیں اور جدید نسلیں اُن کی جانشین ہوتی رہیں۔ موت اِس پورے نظام کا سب سے اَہم جزء ہے۔

قبل از وقت موت، شدّت کے ماتحت موت یا دردناک موت میں یقیناً شر نظر آتا ہے، لیکن صرف اِنفرادی نقطۂ نظر سے ہم اُسے شر قرار دے سکتے ہیں ورنہ معاشرتی واجتماعی نقطہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً مصیبت یا شر کا یہ پہلو جو اُس میں نکلتا ہے وہ صرف بے وقت ہونے یا دردناک ہونے میں نکلتا ہے، ورنہ خود موت معاشرتی حیثیت سے شر نہیں بلکہ خیر ہے۔ ہمارا جذبۂ خود غرضی ہمیں مجبور کرتا ہے کہ موت کو بُری چیز قرار دیں۔ ورنہ معاشرت کا نظام تو چاہتا ہے کہ ہم اُسے اپنے وقت پر بغیر کسی ناپسندیدگی کے قبول کریں۔

کہا جاتا ہے کہ بادشاہ عجم زرکیس نے یُونان پر حملہ کے لئے ایک عظیم الشان فوج جمع کی، اس کے بعد ایک پہاڑی پر چڑھ کر پُوری فوج پر نظر ڈالی، دیکھا کہ بحری حصہ اُس کے جہازوں سے اور ساحل کا خشک حصہ اُس کے سواروں سے سے پٹا پڑا ہے، اِس منظر کو دیکھ کر زرکیس پہلے تو مسرور رہا، لیکن فوراً بعد ہی رونے لگا، اور اُس کی وجہ یہ بتائی کہ جب میں نے اپنی فوج کی یہ کثرت دیکھی تو مسرور رہا اور جب یہ سوچا کہ ایک صدی کے بعد اُن میں سے کوئی باقی نہ رہے گا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

ذرا سوچو تو یہ خیال رُونے کا سبب ہو سکتا ہے؟ البتہ یہ خیال رُونے کا

حقیقی سبب بن سکتا ہے کہ بادشاہ اور اُس کی فوج آئندہ ایک صدی، یا ایک ہزار سال تک ایسے ہی رہیں گے، اور نئی پَود جس نے اُن کی جگہ لی نہیں پیدا ہوگی۔ آنے جانیوالی چیزوں سے افسوس تو ہوسکتا ہے لیکن یاس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

اگر زرکیس کے عہد کو دوام بخش دیا جاتا تو ہم کہاں پیدا ہوسکتے تھے، اور زرکیس ہی کے عہد کو کیوں دوام ملتا، ابتدائی نمودِ حیات یعنی امیبہ کو دَوام مِل جاتا تو یہ سارے جانور یہ انسانوں سے بھری ہوئی دُنیا کیسے وجود میں آتی؟

اگر آج کوئی پیام خالقِ کائنات کی طرف سے آئے کہ موجودہ نسلِ انسانی کو دَوام دیا جاسکتا ہے، اور آئندہ نئے تصورات، نئی اُمیدوں، اور نئے خیالات کے ساتھ کوئی نسل پیدا نہ ہوگی تو جذبات خودغرضی سے اَلگ ہوکر بتاؤ اُس پیام کا جواب کیا ہوگا؟

طبعی مصائب میں سے دَرد و تکلیف کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن اگر انسان کبھی نہ مَرتا اور نہ کبھی اُس کے بدن کو کوئی دُکھ پہنچتا، بلکہ رُوئیں تن ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اِنسان کیوں اپنے گردوپیش کی مادی دُنیا سے واسطہ رکھتا، اپنے فائدہ، اپنی غذا، اپنی حفاظت اور اپنی شفاء وصحت کے لئے اِتنی دردسری کیوں اُٹھاتا۔ دُنیا ساری کی ساری، بےکار، بےضرورت، اور ناکارہ اشیاء کا مجموعہ نہ رَہ جاتی؟ اور اِنسانی فکر و بصیرت کے لئے کوئی جولان گاہ باقی نہ رہتی، اگر دُنیا کی تمام اشیاء کو بکارآمد رکھنا تھا، اگر دُنیا میں اِنسانی فکر و بصیرت کو متعطل رکھنا منظور نہ تھا، اور جمود سے بچانا تھا، تو دَرد و تکلیف کا وجود بھی ازبس ضروری تھا۔

اِحساس درد سے صرف اتنا ہی نہیں ہوتا ہے کہ اِنسان اُس کی بدولت عالمِ مادّہ کو مسخر کرنے اور اپنی حفاظت کی گوناگوں تدابیر میں لگ جاتا ہے، بلکہ اُس سے اَعصاب میں جو سنسنی پیدا ہوتی ہے اور دَماغ پر جو اُس کا ردِعمل ہوتا ہے

وہ آئندہ کی شدید تر تکلیف سے متنبہ کر دیتا ہے۔ اِس طرح یہ احساس ایک عقوبت نہیں بلکہ ایک نعمت بن جاتا ہے۔

ذرا تھوڑی دیر کے لئے انسانوں کی حالت کو چھوڑ کر جانوروں کی حالت پر غور کرو، یہ تو سب جانتے ہیں کہ نہایت بے دردی کے ساتھ ایک جانور دوسرے کو کھا جاتا ہے، یہ بات بہت بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے اور جانوروں کے لئے عام بات ہے یہی طریقہ ہے جس سے شر کا پلہ عام نظام اشیاء میں بھاری ہو جاتا ہے لیکن ذرا اور دِقت نظر کے ساتھ غور کرو۔

ہم کو انسانی معیار کے ایسی جگہ استعمال کرنے سے پوری طرح احتیاط کرنی چاہیئے جہاں یہ ٹھیک نہ بیٹھتا ہو ہم کو دوسرے جانوروں کے سکون و ہیجان کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو مختلف انواع کے افراد میں باہمی ہمدردی اور ترس کا جذبہ عادتاً مفقود ہوتا ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ احساس درد، جذبات تیقظ، ہیبت، و بے چینی جانوروں میں اس طریقہ سے بالکل مختلف طریقہ پر ہے جو ہم انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً رینگنے والے جانوروں میں یہ اختلاف بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے اگرچہ ہمارے تصور کے بموجب اُن میں انتہائی بے دردی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، پروفیسر وہیلر کے اس بیان پر غور کرو۔ پروفیسر موصوف اجتماع پسند کیڑوں کی حد تک ایک سند مستند کا درجہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

"اِس اثناء میں کہ کوئی چیونٹی شیرہ یا شربت سے اپنی غذا حاصل کرتی ہو اُس کے معدہ کو قینچی سے کتر دیا جا سکتا ہے، اور اُس کے کھانے میں اُس سے کوئی خلل نہیں پڑے گا"

انسانوں کی حالت سے کتنی مختلف حالت ہے گویا یہ اُس دُنیا کی بات ہی نہیں ہے۔

اِس جگہ دو ایسے مفکرین کے نتائج تحقیق و دلچسپی کا باعث ہوں گے جنھوں نے اپنی زندگیاں جانوروں کی حیات پر غور کرنے کے لئے وقف کر دی ہیں یہ دونوں حضرات اپنی علمی تحقیقات کے علاوہ انسانی ہمدردی کے لئے بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں —— الفریڈ رسل ویلیس لکھتے ہیں۔

"آج کل جب کہ تنازع فطرت سے نسبتہً زیادہ واقفیت حاصل ہے ہمارے اکثر ارباب قلم اسے بیرحمی و بیدردی کی ایک طویل داستان بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ داستان انسانی طبیعت کے خلاف بغاوت سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس یقین کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ یہ ساری داستان واقعہ نہیں بلکہ بڑی حد تک محض مبالغہ ہے، جانوروں کی مفروضہ بپتا اور ایذا رسانی کا کہیں حقیقتہً وجود نہیں ہے، بلکہ اچھے بھلے مردوں اور عورتوں کا ان ہی حالات میں کیا حال ہوتا۔ اس تصور کا عکس ہے جو جانوروں کی داستان مصیبت بن گیا ہے۔ ورنہ خود جانوروں کے اندر بھی جو تنازع للبقاء جاری ہے، اور اس سے وہ جس قدر متاثر ہوتے ہیں، وہ اُن کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ . . . . . . بہرحال ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تنازع للبقاء سے متعلق یہ معروف تصور کہ اُس سے جانوروں کو دکھ ہوتا ہے یا عقوبت جھیلنا پڑتی ہے قطعاً حقیقت کے بالکل برخلاف ہے۔ جو بات حقیقتاً معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حد زیادہ سے زیادہ زندگی، اور کم سے کم دکھ اور درد کے ساتھ زندگی سے استفادہ، یہ ہے آرزو — ایک کی موت اور دوسرے کی ولادت اس لائحہ عمل کی ضرورت تو ماننا ہی پڑے گی، بغیر اُس کے عضویاتی

دُنیا کی ساری ترقی بند ہو جائے گی۔ ایسے لائحہ عمل کا تو تصور بھی مشکل ہے جس سے مسرتوں کی مزید مقدار محفوظ کرلی جا سکے۔"

چارلس ڈارون صاحب نے بھی یہی خیال پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"جب ہم اِس تنازع للبقاء پر غور کرتے ہیں تو ہمارے قلوب کو اِس یقین سے تسکین ہو جاتی ہے کہ حقیقتاً یہ جنگ فطرت جو جانوروں میں ہوتی ہے وہ مسلسل جاری نہیں رہتی، اور اُس سے کوئی خوف و دہشت بھی اُن میں نہیں پائی جاتی، عام طور سے موت پر آمادگی موجود ہے، اور بعد کو زیادہ تعداد میں زیادہ مسرور، زیادہ تندرست اور زیادہ قوی جانشین پیدا ہو جاتے ہیں۔"

اِس بیان کے بعد بھی ایسی بہت سی مصیبتیں باقی رہ جاتی ہیں جن سے بنی نوع انسان کو واسطہ پڑتا رہتا ہے مثلاً غیر معمولی اموات، حد سے بڑھی ہوئی تکالیف، بے قصور اشخاص پر طبعی و اخلاقی مظالم کے بے شمار واقعات۔

اِن مصائب کے بارے میں تین خیالات ہیں جن پر غور کرنا چاہیئے۔

اول یہ کہ اگر انسان کو چند مضرتیں پہنچتی ہیں، تو بہر حال یہ مضرتیں اسی دنیا سے متعلق ہیں جس میں جمود نہیں روانی پائی جاتی ہے آج کچھ مضرتیں ہیں تو کل کچھ فائدے بھی ہوں گے۔ دنیا تو ایک عمل مسلسل کی حیثیت رکھتی ہے، مضرت کو صرف اِس طرح نہ دیکھو جس طرح وہ حال میں ہیں، بلکہ یہ بھی دیکھو کہ مستقبل میں یہ کیا ہونے والی ہیں۔ واقعات و حوادث کا دھارا اسے ماضی سے مستقبل کی طرف لے جا رہا ہے، یہ مضرت عنقریب یا ختم ہو جائے گی یا منافع کی شکل اختیار کرلے گی۔

حیوانات چند نسلوں کے اِرتقائی دَور سے عبور کرنے کے بعد غیر شعوری طور پر

ماحول کے موافق بن جاتے ہیں۔ایک مہذب انسان اپنے شعور کے ذریعہ خود ماحول کو کسی حد تک اپنے مطابق بنالیتا ہے۔ ایسا کر کے وہ مضرت و مصیبت کو بے اثر کر دیتا ہے۔

مثلاً قدیم مصریوں کے لئے دریائے نیل کی طغیانی سب سے بڑی مصیبت کا باعث تھی، اگر دریائے نیل میں پانی پوری طرح نہیں آیا تو سارا ملک بے آب و گیاہ ہوگیا۔ زمینیں بنجر پڑی رہیں، پورا مصر تباہی میں مبتلا ہوگیا، پہلے سال تنگی ترشی رہی اور دوسرے سال قحط اور فاقوں سے موت کا بازار گرم ہوگیا — اسی طرح اگر دریا میں پانی زیادہ آگیا تو سارا ملک سیلاب کی نذر ہوگیا، کھیتیاں بہ گئیں، مکانات مسمار ہوگئے۔ سارا علاقہ تہ آب ہوگیا، مال گیا، جانیں گئیں اور جو بچ رہے اُن کے پیٹ بھرنے کا سہارا باقی نہ رہا — مصریوں کو انسانی اقتدار سے باہر کوئی چیز اس دریا سے زیادہ ناقابلِ دسترس دکھائی نہ دیتی تھی۔ تقدیر کی نادیدہ طاقت کا مظاہرہ جیسا یہاں ہوتا تھا شاید کسی دوسری جگہ نہ ہوتا ہوگا۔ اِس مصیبت کو دفع کرنے کے لئے دعائیں، قربانیاں، اعمالِ حسنہ وغیرہ سے استعانت کا موقع تھا، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اِس مصیبت کو انسانیت کے حق میں خدا کی بے انصافی، سمجھکر اپنی بے بسی کے اقرار کے ساتھ برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن نہیں، آج یہی عظیم الشان ناقابلِ ارتفاع مصیبت بنی نوع انسان کے مصائب کی فہرست سے خارج کردی گئی — قدیم مصری دریائے نیل کے دیوتا کو راضی کرنے کے لئے مندر بناتے تھے لیکن جدید مصریوں نے دریا کی رَوانی کو قابو میں لانے کے لئے بند بنا ڈالے، — حکومت مصریہ نے بڑے بڑے خزانۂ آب بنوائے، سیکڑوں میل لمبی نہریں تیار کرائیں، ہزاروں آب رَو دروازے تعمیر کرائے۔ ماہرین کا ایک وسیع عملہ آب پاشی کی نگرانی کرتا ہے۔

اَب مصری کسان کھیتی باڑی کرتا ہے اور یہ اطمینان رکھتا ہے کہ پانی حد سے زیادہ یا ضرورت سے کم نہیں آئے گا۔

وبائیں مثلاً کالا بخار، طاعون، ہیضہ وغیرہ سارے براعظم یورپ پر جھاڑو پھیر دیتے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں یہ وبائیں پھیلتی رہتی تھیں۔ جہاں وبا پہنچی، آفت آئی، دماغ بے کار اور ہاتھ پیر شل ہوگئے، ایک مصیبت ہے کہ ناقابل علاج ہے۔ آدمی کے بس کی بات نہیں، خدا کا کام خدا ہی جانے، ——— لیکن آج یہ باتیں افسانۂ ماضی ہوگئیں۔ اب کالی بلا کا پتہ نہیں، طاعون کا وبائی مرض اور ہیضہ کا حملہ شاذونادر ہوتا ہے اور شروع ہوتے ہی ختم کر دیا جاتا ہے ——— امراض کو روکنے والی اور علاج کرنیوالی دوائیں کامیاب ہیں ——— اور انسان ہر نسل میں ——— مصائب کی فہرست سے مرض پر مرض خارج کرتا جا رہا ہے۔

کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک قنوطی اپنے بیان کو ختم بھی نہیں کر چکتا ہے کہ وہ تکالیف جن پر اُس کے دعویٰ کی بنیاد قائم تھی ختم ہو جاتی ہے۔ شوپنہار نے قصد کیا کہ عالم پر مصائب کے محیط ہونے کا ثبوت دے، اُس نے مثال میں پیش کیا کہ:۔

> "لوگ اس قدر مصائب، محتاجی، اور موت کو برداشت کر رہے کہ حد و حساب سے باہر ہے، امریکہ کے لاکھوں زنگی غلام اور یورپ کے ۴۰ لاکھ باشندگان فاقہ کشی اور محتاجی میں بسر کر رہے ہیں، اُن کی بدنصیب زندگیاں نمناک کمروں اور بشاشت سے خالی کارخانوں میں بسر ہو رہی ہیں"

شوپنہار نے جب یہ لکھا تھا اُس سے بیس ہی سال کے اندر امریکہ نے غلامی کا سلسلہ

ختم کر دیا، اور پچاس سال کے اندر ہی یورپ کے باشندوں کی حالت بڑی حد تک سدھر گئی، اگرچہ قابل اطمینان درجہ تک تو ابھی ترقی نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باشندگان کی حالت اب ویسی نہیں ہے جیسی شوپنہار نے پیش کی تھی۔

سمندر میں طوفان نے اگر انسانوں کو ڈبویا تو انسان نے اس کی وجہ سے ایسے بڑے بڑے جہاز بنانا اور اتنے قوی انجنوں سے اُن کو چلانا سیکھ لیا کہ آج وہ طوفانوں سے گذر سکتا ہے۔ اُس نے قطب نما بنا ڈالا، اُس نے زاویہ پیما تیار کر لیے۔ فن جہاز رانی کو ترقی دی، ساحل بنائے، روشنی گھر تعمیر کر لئے ——— اگر مکانات بجلی سے خراب ہو گئے اور زلزلوں سے منہدم ہو گئے تو آدمی نے بجلی کو دوسری طرف منحرف کر دینے کا فن سیکھ لیا، ایسے مکانات بنا کر تیار کئے جو زلزلہ میں منہدم نہیں ہو سکتے ——— اگر بنجر علاقہ میں فاقہ کشی برداشت کرنی پڑی تو لاکھوں کی تعداد میں دوسرے زرخیز علاقوں میں جا کر بس گئے۔ اگر بڑے شہروں میں گنجان ہونے کی وجہ سے دقتیں ہوئیں اور بیماریاں پیدا ہونے لگیں تو آب وہوا کو صاف کرنے کے نئے نئے طریقے معلوم کر لئے گئے۔ درد کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے مسکن اَدویہ تلاش کی گئیں ——— معاشرت کی بُرائیاں جو غلط طریقۂ حکومت سے پیدا ہوتی تھیں اُصولی جمہوریت کی ترقی سے کم کی گئیں ——— کاش کوئی سلبی اعداد شمار کا طریقہ اختیار کر کے ان برائیوں کے اعداد پیش کر دیتا جو اب نہیں پائی جاتی ہیں۔

بعض ایسی مصیبتیں واقعتہً ہمارے اس کرہ کی طبعی حالات کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہیں جن سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ ۳۰ ؍جون ۱۹۰۸ء کو سائبیریا کے ضلع اینسی میں ایک بہت بڑا شہاب ثاقب گرا جس سے متعدد آتش فشان

دہانوں سے آگ بھڑک اٹھی اور ایک ہزار میل کا نوخیز جنگل خاک سیاہ ہو کر رہ گیا، اس سے پہلے کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا شہاب ثاقب اس علاقہ میں گرا تھا جو آج کل صحرائے اریزونا کہلاتا ہے، اس سے تقریباً ایک میل عریض سوراخ پیدا ہو گیا۔ اس قسم کے حوادث سے نہایت خوفناک مصائب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مقابل اتفاقات میں بھی بڑی وسعت ہے لیکن بلا شبہ ایسی صورتوں کو ہم "بس سے باہر" شمار کرنے پر مجبور رہیں۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ لوگ بجلی گرنے اور طوفان آنے سے مرتے رہتے ہیں۔ جو شہر تو ہے، کنکریٹ یا بانس اور کاغذ وغیرہ سے تعمیر نہیں ہوتے وہ زلزلہ سے مسمار ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں کی جانیں جاتی ہیں۔ غرض کہ ایسی مصیبتیں ہیں جن سے بچنا ناممکن ہے لیکن یہ بہت کم ہیں۔

دنیا کی تمام چیزوں میں حرکت ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کل کی مصیبتیں آج ختم ہو چکی ہیں اور بجا طور پر امید رکھتے ہیں کہ آج کی مصیبتیں کل ختم ہو جائینگی ممکن ہے ان مصیبتوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی ہم کل تک معلوم کر لیں۔

دوسرا نکتہ جسے یاد رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک فرد اپنے آپ کو حالات زندگی کے مقابلہ میں تنہا پا سکے۔ اور یہ محسوس کرے کہ ایک شخص اور مواقع حیات کے مابین غیر مساویانہ جنگ جاری ہے۔ بلکہ اُسکے اور مواقع حیات کے مابین ایک چیز اجتماع بھی ہے۔

ہم میں سے ہر شخص۔ مختلف قسم کے اجتماعی نظام کا جزو ہے، خانوادہ ہے شہر ہے، حکومت ہے، مفادات پر مشتمل جمعیتیں ہیں، پارٹیاں ہیں، مذاہب ہیں اقوام ہیں —— ہمیں اجتماعی نظاموں کی رکنیت سے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ ہر شخص گذشتہ و موجودہ افراد اور نسلوں کے کارناموں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور اسی طرح ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ جو آفتیں ہم پر آجاتی ہیں اگر اُن میں سے کسی ایک کی مکمل تحقیقات کی جائے اور اسباب وعلل کی زنجیر کے ایک دوسرے سے پیوستہ حلقوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ آفت صرف حادثۂ طبعی نہیں بلکہ بالواسطہ یا بلا واسطہ نتیجہ ہے اس غلطی کا جو زمانہ ماضی میں فرد، افراد یا جماعتوں سے سرزد ہوئی تھی، یہ غلطی ہو سکتی ہے کہ خود ہمارا عمل ہو یا ہماری طرح دوسرے انسانوں کا عمل، یہ غلطی کسی کام کے کرنے نہ کرنے یا وقت سے بے وقت کرنے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

یہ مصائب درحقیقت کسی اندھی تقدیر کا تیر نہیں ہوتے، جو نہ کچھ سمجھتی ہو اور نہ سنتی ہو، انسانی سعی وعمل جس کے مقابلہ میں بے کار اور دنیاوی اُمید و اَمَل جس کے حضور میں بے نتیجہ ثابت ہوں، بلکہ مصائب انسان کے اعمال یا بے عملی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، خواہ یہ نتیجہ بالواسطہ ہوں، یا بلا واسطہ۔

انسان چونکہ اجتماع پسند ذی روح ہے اس لئے عادتاً یہ اُصول اتحاد باہمی کا بھی پابند ہوتا ہے جب کبھی ایک جماعت یا گروہ درست عمل کرتا ہے تو جماعت انسانی کے تمام افراد اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، اسی طرح جب کبھی کوئی جماعت یا گروہ نادرست عمل کرتا ہے تو اس کا خمیازہ بھگتنے میں بھی سب حصہ دار ہو سکتے ہیں مثلاً ایک ملک ہے کہ وہاں وبائی امراض کے خلاف کامیاب جد وجہد اور احتیاط برتی جاتی ہے، اس ملک کے تمام افراد صحت وسلامتی سے بہرہ ور ہوں گے، دوسرا ملک ہے کہ وہاں اس قسم کی کوئی جد وجہد نہیں کی گئی، ظاہر ہے کہ اس دوسرے ملک کے ہر فرد کے لئے وبا میں مبتلا ہو جانے کا امکان موجود ہے ——

اس قسم کے معاملات میں اگر ہم فرد کو دیکھتے ہیں تو بے انصافی اور مصیبت معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر ہم جماعت کو دیکھتے ہیں تو یہ مصیبت بالکل منصفانہ نظر آتی ہے۔

دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک اسکیم کے ماتحت ہو رہا ہے اور اس اسکیم کی

بنیاد قائم ہے "وحدتِ انسانیت" پر اس لئے متحدہ اعمال اور صحیح راہِ عمل اجتماع کے ہر رکن کے لئے فرد اور خانوادہ سے لیکر مجموعہ اقوام تک سب کیلئے ضروری ہے۔ اگر اس میں خرابی آئی تو پھر عافیت معلوم! ـــــ وہ مصیبت جو فرد پر آتی ہے، ممکن ہے کہ اس کے ذاتی فعل یا کسی متحدہ عمل کی ناکامی یا غلطی کا نتیجہ ہو ـــــ مصیبت اور تکلیف ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کو اس کی انفرادی یا اجتماعی غلطی پر تنبہ کیا جاتا ہے۔

اس جگہ بھی عالم کائنات کے اس اصول کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا متجدد و متبدل ہے، کوئی جامد، وغیر متبدل شے نہیں ہے۔ اجتماع میں اگر خرابی ہے تو اسے بھی طبعی ماحول کی طرح درست کیا جا سکتا ہے، بلکہ اجتماع کو طبعی ماحول کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ درست کیا جا سکتا ہے۔ جہالت، نقائص، جرائم، امراض، جنگیں یہ سب شائستگی کی ترقی کے ساتھ ختم یا کم ہو سکتی ہیں، اور جب یہ چیزیں کم ہو جائیں گی یا باقی نہ رہیں گی تو اسکی وجہ سے نیکوکار اشخاص جو مصیبتیں جھیلتے ہیں وہ بھی کم ہو جائیں گی؛

تیسرا خیال جو اس سلسلہ میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تناسب و توازن کا اصول ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، ہم کو بالارادہ مساعی کے ذریعہ اطمینان کے ساتھ توازن کے اصول کی پابندی کرنی چاہیئے، ہمیں اپنے جذبات وخیالات کی رو میں آکر کسی ایک پلہ کو جھکا دینے کی کوشش سے حذر کرنا ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مصائب زندگی اسی تناسب سے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جس تناسب سے ہماری توجہ ان کی طرف بڑھتی رہتی ہے، اخبارات کے صفحات جرائم، بلوے، جنگ اور دوسری قسم کی تباہی کی داستانوں سے سیاہ نظر آتے ہیں، اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ ساری دنیا شر و فساد اور تباہی و خرابی کے

واقعات وحوادث سے بھری پڑی ہے۔ یہ خیال کیوں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل مواصلات و رسل و رسائل کی آسانیوں نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ کرۂ ارضی پر واقع ہونے والے ہر حادثہ کی خبر جلد از جلد ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچا دی جائے۔ اخبارات کے نمائندے اور خبر رساں ایجنسیاں ہمارے اجتماع کے حساس عروق و اعصاب ہیں جو اپنا کام تیزی کے ساتھ اس لئے انجام دیتے رہتے ہیں کہ ہم اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہوتے رہیں۔ اور اس کے علاج کی فکر کریں، اس کی وجہ سے یہ تصور صحیح نہیں کہ سارا کرۂ ارضی حوادث و مصائب سے پُر ہے، یا کم از کم حوادث و مصائب بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہیں —— ظاہر ہے کہ ان حوادث کے علاوہ جن کی خبریں ہمیں اخبارات کے ذریعہ ملتی ہیں، کروڑوں انسان عافیت و سکون کے ساتھ بھی تو ہوں گے۔ اُن کے متعلق کوئی اخبار خبر نہیں دیتا۔

کارخانے، جیل خانے، پاگل خانے، اور لاعلاج مریضوں کے دواخانے ہیں اور یقیناً ہیں۔ ان کا شمار تو کیا جاتا ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ سارا شہر یہی نہیں ہے ان سے بہت زیادہ تعداد میں خوشگوار زندگی بسر کرنے والوں کے مکانات بھی تو ہیں —— یہی حال ہے تاریخ کا، ہم جب تاریخ کے اوراق اُلٹتے ہیں تو دل ہلا دینے والے واقعات وحوادث کا ایک طویل و وسیع جنگل دکھائی دیتا ہے جس میں حوادث کی ویران پہاڑیاں اور چٹانیں نظر آتی ہیں —— جنگ، مذہبی و سیاسی فسادات، سازشیں، ستم رانیاں، طاعون، اور زلزلے — ان حالات و حوادث کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کا زمانہ اور ملک کا ملک ان ہی جنگلوں اور پہاڑوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں ان پہاڑوں اور جنگلوں کے بیچ میں بہت سے سرسبز میدان، اور بہت سی

آبادیاں ہیں جہاں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے چین وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جدید دماغ صداقت کو اوّلین درجہ پر رکھتا ہے ـــــ پچھلی جنگ عظیم کا ہولناک تجربہ سامنے ہے، فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ دنیا میں حیرانی، پریشانی اور بے چینی کا دور دورہ ہے، اجتماعی زندگی خطرے میں ہے اور تباہ ہو رہی ہے، افراد کا کیا کہنا! موت کی گرم بازاری ہے، کھیتیاں برباد ہو رہی ہیں، شہر ویران ہو رہے ہیں ـــــ دُنیا کی آبادی کا کتنا بڑا حصہ ہے جو جان و مال کی بربادی سے دوچار ہو رہا ہے ـــــ اس صورت حال سے دماغ میں سکون کی بجائے ہیجان بپا ہو گیا، اُنیسویں صدی کی رجائیت کہ

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اِس کو خلاف واقعہ معلوم ہونے لگی ـــــ یہی نہیں بلکہ جدید دماغ نے فیصلہ کیا کہ اُنیسویں صدی کی علمی ترقیوں سے یہ اُمید کہ دُنیا کے لئے مفید ہوں گی، غلط ثابت ہوئی ـــ اِس ترقی سے تہذیب انسانی آگے بڑھ سکے، یہ صحیح نہیں ہے، جدید دماغ کے سامنے یہ سوال آیا کہ فن حیاتیات میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے بعض انواع حیوانات نیست و نابود ہو گئے اور خود انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ تہذیبیں پیدا ہوئیں اور مٹ گئیں تو ہم اِس خیال پر کیسے یقین کر لیں کہ فطرت کی کوئی ایسی طاقت بھی موجود ہے جو ہمارے مساعی سے بے نیاز ہو کر دنیا کو آگے بڑھا رہی ہے، یا اس پر کس طرح مطمئن ہو جائیں کہ حدوث عالم کا اصول جب سے معلوم ہوا ہے، دنیا میں شر کے وجود کا مسئلہ ناقابل اعتناء ہو گیا ہے۔

اِن خیالات کا اُثر یہ پڑا ہے کہ موجودہ دَور کے افکار میں قنوطیت کی ایک لہر سی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سے لوگ زندگی کو صرف "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کے اصول پر نباہ رہے ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ زندگی ایک بے کیف چیز ہے، چونکہ ہم اس کے سوا کچھ کر نہیں سکتے کہ بہرحال اسے گذار دیں، اس لئے گزار رہے ہیں ——— حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات توازن واعتدال کے فقدان کا نتیجہ ہیں ———

جب ہم اس کائنات کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں، ۔ دُنیا کی پیدائش اور تہذیب کی نشوونما پر غور کرتے ہیں، انسانی آزادی کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں، سائنس کی ترقیوں کو دیکھتے اور غور کرتے ہیں کہ آج انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے چیزوں کی کس قدر افراط ہے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ دنیا میں شر نہیں بلکہ خیر کا پلہ بھاری ہے۔ اگر ہم اپنے کانوں کو فطرت کی آواز کی طرف متوجہ کریں، تو اُس کے گوناگوں نغموں کو اچھی طرح سُن سکتے ہیں، یہ نغمے فتحمندی، مسرت اور شادمانی کے نغمے ہیں، نوحہ و مرثیہ نہیں ہے۔ اگر اس دنیا میں کہیں کہیں آنسوؤں سے بھرے ہوئے گڑھے ہیں تو مسرت وشادمانی سے لہلہاتے ہوئے چمن اور مرغزاروں کی بھی کمی نہیں۔ اور خوشی کی ایسی دلفریب چوٹیاں بھی موجود ہیں جو آفتاب کی کرنوں میں جگمگا رہی ہیں۔

اس ساری بحث کا نتیجہ قنوطیت نہیں ہو سکتا، اور اگر رجائیت سے یہ مطلب ہے کہ شر کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ شر اور مصائب کا علاج خود بخود ہو جائے گا تو اس بحث کا نتیجہ رجائیت بھی نہیں نکلتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قنوطیت و رجائیت

دونوں کے برخلاف نتیجہ "اِصلاحیت" ہونا چاہیئے —— جارج ایلیٹ کی زبان میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ :-

"یہ تو یقینی ہے کہ حال ماضی سے بہتر ہے، اور مستقبل حال سے بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کوشش کی جو اُس کو بہتر بنائے"

آٹھواں باب

دُرست و نادُرست

دُرست و نادُرست

عصرِ حاضر میں دُرست و نادُرست کے لیے کوئی ایسا معیار موجود نہیں ہے جسے سب قبول کریں۔ عادتاً لوگ اس معاملے میں اپنے آبائی مذاہب کی طرف نظر دوڑاتے تھے کہ وہاں سے انہیں کوئی معیار مل جائے گا۔ لیکن اس زمانے میں ہر مذہب کے پیرو دوسرے مذاہب کے وجود سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ یہ دوسرے مذاہب بعض اوقات اُن کے اپنے مذہب سے بالکل مختلف معیار پیش کرتے ہیں۔ اس لیے موجودہ زمانے میں اِن معیاروں کا مستند ہونا خود قابلِ بحث ہو گیا ہے ——— اِلہام، وجدان اور ضمیر آج ان میں سے کسی دعوے کو بغیر تنقید قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہم و قیاس کو تو عقل کی عدالت میں پیش ہونا ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود عقلی استدلال کے لیے بھی کوئی ناقد و مبصر مل سکتا ہے؟

ہم اُمید کرتے تھے کہ شاید فلسفہ ایک مبصر کا کام انجام دے سکیگا۔ لیکن اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ فلسفہ اس سلسلہ میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتا ——— ایک مدت دراز سے تصوریت فلسفیانہ افکار پر چھائی ہوئی ہے۔ افلاطونیوں نوفلاطونیوں، کانٹیوں اور ہیگلیوں نے بہت سر مارا کہ تصورِ حسنات، خیرِ مطلق،

آمر قطعی، اور صداقت، حسن اور نیکی کا قدرتہائی دریافت کریں، اِس طرح اُن کے ذریعہ سے اِنسانی زندگی کے لیے رہبر کامل پیدا کر لیا جائے، لیکن دو ہزار سال کی محنت شاقہ اور دماغی کاوش سے کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں کیا جا سکا جو قبولیت عام حاصل کر سکتا ——— سچ یہ ہے کہ فلسفہ کا کوئی مکتب خیال ایسا موجود نہیں جس کے متعلق ہم یہ کہہ سکیں کہ وہاں بنی نوع اِنسان کے لیے عملی اخلاقیات کی عقلی بنیاد مِل سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے مفکرین نے فطری حقوق کا اُصول پیش کیا، اور اِس پر اِصرار کیا کہ دُنیا میں آنے والا ہر اِنسان اپنے سماج میں چند بنیادی حقوق رکھتا ہے۔ طے یہ کیا گیا کہ تمام قوانین وضابطے اِن بنیادی حقوق کے مطابق ہونے چاہئیں۔ درست و نادرست کا معیار یہی بنیادی حقوق ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ فطری حقوق کا نظریہ اس زمانے کی سیاسیات پر طاری و ساری تھا۔ اُمریکی اِعلان آزادی کے تمہید میں لکھا ہے کہ:۔

"ہم اِس صداقت کو بدیہی مانتے ہیں کہ ہر اِنسان پیدائشی طور پر مساوات رکھتا ہے، خالق مطلق اِنسان کو پیدا کرتے وقت اُسے چند غیر منفک حقوق بھی عطا فرماتا ہے، اِن ہی میں سے زندگی، آزادی، اور تلاشِ مسرت کے حقوق بھی ہیں"

تیرہ سال کے بعد فرانس کی قومی مجلس نے اِعلان کیا کہ:۔

"تمام سیاسی جمعیتوں کا آخری مقصد اِنسان کے فطری اور اِمتداد زمانہ سے زائل نہ ہونے والے حقوق کی حفاظت ہے، یہ حقوق، آزادی، جائیداد، ضمانت اور مزاحمت ظلم کے اختیارات ہیں"

کسی صداقت کو اُس وقت تک بدیہی نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ ہر سمجھ دار آدمی کیلئے

جنسی تشوق وغیرہ تمام اُصولی تحرکات وجدانی ہوتے ہیں۔ یہی حال ہے جذبات ہمدردی کا جن سے اخلاقیات کی بنیاد پڑتی ہے، اور اسی طرح ہوتا ہے احساس جمال جس سے حسن کاری پیدا ہوتی ہے۔

اس زمانہ کے مفکرین میں عام طور پر یہ ذہنیت پائی جاتی ہے کہ وجدان کا پایہ بڑھادیں اور فراست وتعقل کا مرتبہ گھٹادیں۔ یہ صورت کسی حد تک فروڈ اور اس کے مکتب کی حالیہ نفسیاتی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ اور کسی حد تک نیتشے، برگسان اور کروس کی فلسفیانہ تعلیمات بھی اس صورتِ حال کی ذمہ دار ہیں۔ — جرمنی اور ایطالیہ کی سیاسی تحریکات نے جن کے خیالات مذکورہ تعلیمات سے ماخوذ ہیں، اس ذہنیت کو دنیائے عمل تک پہنچادیا ہے۔ آج کل ان تحریکوں نے واقعات کی صورت گری میں اس ذہنیت کو نہایت قوت کے ساتھ موثر کیفیت دیدی ہے۔ سیاسیات میں جو اہمیت انھیں حاصل ہوگئی ہے اس سے اُصول وجدان کو اور بھی غیر معمولی اِعتبار حاصل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے چاروں طرف تعقل واستدلال سے برگشتگی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

یہ ایک ایسی موثر چیز ہے جو مذہب، اخلاق، اور ریاست سب پر اثر انداز ہے، ضرورت ہے کہ ہم دقتِ نظر کے ساتھ اس کی تنقیح کریں:

کیا ہمارے معمولی وجدانی خیالات واعمال ہماری فطرت روحانی سے پیدا ہوتے ہیں؟ کیا عقل وفراست کے مقابلہ میں یہ زیادہ مستند قرار دیئے جاسکتے ہیں؟ اور کیا وہ اِس ضمیر کے آثار ہیں جو قدرت نے ہم کو اِس لئے ودیعت کیا ہے، کہ اگر ہم اس کی آواز پر کان دھریں تو وہ ہمارے لئے راہ صواب کی طرف بے خطا راہ بر ثابت ہو؟

یا یہ سب اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ عضویاتی حیات کے طویل ارتقا سے

ہمیں جو طبعی وراثت ملی ہے، یہ بھی اس کا ایک جزء ہے؟ اور حیات سادہ کی جبلت ہے جو ترقی پذیر اور وسیع صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ تعقل و فراست سے برتر نہیں بلکہ اس ارتقائی دور کی یادگار ہے جب کہ تعقل و فراست ابھی کام نہیں کر رہی تھی؟

عادتی وجدان سے آگے بڑھ کر جب ہم اس چیز تک پہنچتے ہیں جس کے باطنی کشف ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو مسئلہ بالکل دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے اگر یہ علم واقعتہً انسانیت سے برتر کوئی چیز ہے تو اس کے مستند قرار پانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی کشف اس کی طرف سے ہے جو ہمارے عالم محسوس سے باہر ہے یا یہ بھی ہمارے ہی خیالات ہیں جو خود ہمارے اندر سے پیدا ہو رہے ہیں، اور ان کی حیثیت دماغ کی ایک چال سے زیادہ نہیں، یا پھر یہ صورت ہے کہ بعض واقعتہً کشف ہوتا ہے اور بعض دماغ کی ستم ظریفی، اگر یہ صورت ہے تو پرکھنے کی ہمارے ہاتھ میں کیا تدبیر ہے؟

سائنس اس سے انکار نہیں کرتا کہ کسی انسان کو ماوراء عالم محسوس سے کوئی قابل استناد علم حاصل ہو، اس کو جب اپنی تسلیم کردہ دنیا سے متعلق کسی نظریہ کے قبول یا انکار کرنے میں تامل ہے تو سائنس کو کسی ایسے نظریہ کے قبول و انکار پر کہیں زیادہ تامل ہوگا جو اس کے حدود نظر سے باہر ہے۔

حقیقت ہے کہ مرتاض اور باطنی مشق کرنے والے حضرات کبھی کبھی عصبی مزاج کے لوگ ہوتے ہیں اور اکثر جب کہ ان کے بدن غیر معمولی حالت میں ہوتے ہیں اس وقت وہ بعض اثرات قبول کر لیتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ یہ اثرات سلبی ہوں یا ایجابی۔ ولیم جیمس جس نے بہت زیادہ اس عالم کو سائنس کی

نظر سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اپنی کتاب "مذہبی تجربات کے تنوعات میں لکھتا ہے کہ :۔

" اگر عالم بالا کی طرف سے کشف کوئی چیز ہے تو اس کو حاصل کرنے کی صلاحیت عصبی مزاج سے بہتر طریقہ پر پیدا ہو سکتی ہے"

ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ :۔

" جیسے ہمارا شعور ہمارے احساسات کو مادیات سے ربط کیلئے کھول دیتا ہے، بالکل اسی طرح منطقی طور پر یہ بھی قابل قبول ہے کہ بلند تر روحانی ذرایع موجود ہوں جو براہ راست ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان کے لئے ہماری نفسیاتی حالت کافی ہو سکتی ہے کہ ہم ایک تحت الشعوری کیفیت بھی رکھتے ہیں اور صرف وہی کیفیت ان بلند تر روحانی ذرایع سے اثر پذیر ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا کہ بیداری کی پر شور زندگی میں ایک دروازہ بند ہو جاتا ہو، اور خواب کی سی ماوراء وجدانی کیفیت میں کھلے رہتے ہوں"

یا جیسا کہ برنارڈ شا نے اپنی کتاب " سینٹ جون " میں لکھا ہے، وہ کہتا ہے :

" جون - میں ایسی آوازیں سنتا ہوں جو بتاتی ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، یہ آوازیں خدا کی طرف سے آتی ہیں"

" رابرٹ - یہ آوازیں خود تمہارے تصورات کی دنیا سے آتی ہیں"

" جون - بے شک، خدا کی آوازیں ہم تک کہاں آتی ہیں"

باہر سے قابل استناد پیام کے آنے کا امکان ناقابل انکار ہے، لیکن امکان اور واقعہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہمارے زمانہ میں جس باطنی طریقہ کا پوری توجہ توضیح اور پوری احتیاط کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے، وہ ہے ہندوستانی یوگ۔

جو شخص ہندوؤں کے علم باطن پر کوئی کتاب مطالعہ کرتا یا کوئی تقریر سنتا ہے، اس پر لازماً یہ اثر پڑتا ہے کہ اس طریقہ میں صداقت ہے، یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ یہ طریقہ باوجودیکہ اتنا قدیم ہے لیکن آج تک اتنی قوت رکھتا ہے، لیکن فوراً ہی شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

کیا یہ طریقہ دعویٰ کے مطابق درحقیقت پردۂ احساسات کے پیچھے، وقت و فاصلہ کے حدود سے ماوراء کسی اندرونی مشاہدہ تک پہنچاتا ہے جو ایک ناقابل تشریح ربانی تعلق ہے، یا اس طریقہ سے بخار دماغی کے علاوہ کچھ نہیں پیدا ہوتا، یہ بخار قوس وقزح کی طرح چمکدار روشن، خوبصورت مگر خود اپنے ہی اندر سے پیدا شدہ ایک چیز ہوتی ہے جسے خیالات، تصورات اور فصاحت لسانی سے ملا کر سب کچھ بنا دیا جاتا ہے۔ ہم اس طریقہ کی حقیقت تلاش کریں تو کیا ہمیں کچھ مل بھی سکتا ہے؟

ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب میں حسب ذیل جملہ ہے جس میں مخلوق و خدا کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ جملہ اکثر نقل کیا جاتا ہے۔

"باس کلی نے بدھوا سے پوچھا:- اے مقدس بزرگ مجھے برہما کی حقیقت سے آگاہ فرمائیے، موخر الذکر خاموش رہا۔ سائل نے اصرار کیا، جواب ملا میں تم کو بتا رہا ہوں مگر تم سمجھتے نہیں، خاموشی خود آتما ہے"

کیا یہ جواب زیادہ اثر انداز طریقہ پر صرف "ہم نہیں جانتے" سے زیادہ کچھ اور بھی ہے؟ ہندو علم باطن کے فاضل محقق پروفیسر عائل مرکالت کہتے ہیں:-

"بعض یوگی خصوصاً ہتھا یوگی جن کے ساتھ میں نے ہندوستان میں کام کیا ہے، اپنے نفس کو دبا چکنے کے بعد لازمی طور پر خود

نفس سے بلند و ماورا کسی دوسری چیز تک نہیں پہنچے، اُن کے متعلق یہ میرے تاثرات ہیں۔"

لیکن پروفیسر ندکور کو،

"بڑی حد تک شخصی تجربات سے یقین ہے کہ راجا یوگی کا نفس کی سطح سے بلند مرتبہ تک ترقی کرنا ممکن ہے۔"

پروفیسر گراہم والس آنجہانی عام طور پر باطنی علوم کی دقیق تحقیقات سے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ ایسے تجربات اصولی طور پر ہپناٹزم اور خود اشاریت کے نتائج ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں، اور یقیناً خیالات میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال ایک نقطہ ضرور ہے جس پر عام طور سے اتفاق ہے، وہ یہ کہ ہر دعویٰ الہام اور ربانی رابطہ کا ہر مدعی قابل تصدیق نہیں ہے، یہ کافی نہیں کہ علم باطن کی صداقت مسلم ہے، بلکہ اس شخص کی صداقت کا ثبوت ملنا چاہیئے جو ایسے علم کا دعویدار ہو۔

ولیم جیمس کہتا ہے:۔

"باطنی مشاہدات و تلقینات میں سے بعض تو تمام تر حماقت پر مبنی ہوتے ہیں، ہیبت سے پُر اور لرزہ براندام کرنے کی طاقت کے باوجود بعض اُن میں سے اخلاق و عمل کے لئے بالکل بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں، اُن میں کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی، ربانی و لاہوتی ہونا تو بڑی بات ہے، عیسائی علم باطن کی تاریخ میں اُن تلقینات و مکاشفات کو جو حقیقۃً خرق عادت کے طور پر عالم لاہوت سے حاصل ہوتے ہیں، اُن شیطانی تصرفات سے علیحدہ

دممتاز کرنے کا معاملہ ہمیشہ مشکل ترین مسئلہ رہا ہے، شیطان اپنے تصرفات کے ذریعہ دہوکا دے سکتا ہے، اور ایک دیندار آدمی کو ماقبل کی بہ نسبت دوگونہ قوت سے طفل جہنم کا مرتبہ عطا کر سکتا ہے، اِس لئے کامل صاحب دل کی فہم و تجربہ کی ضرورت ان دونوں میں اِمتیاز کے لئے باقی رہ جاتی ہے۔"

تاریخ ایسے مدعیان نبوت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جو الہام ربانی کے پرزور دعاوی رکھتے تھے، لیکن اُن کے معاصرین اور ان کے مابعد آنیوالی نسلوں نے اُن کے کاذب اور جھوٹے مدعی نبوت ہونے کا فیصلہ کر دیا، اُس کی وجہ صرف فریب نفس اور سادہ لوحی نہیں بلکہ بڑی حد تک دغا بازی کا خیال خام اور مذہبی خبط بھی ہوتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جب میں فلسطین میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ ایک نہیں بلکہ تین اشخاص نے وہاں اپنے عیسیٰ مسیح ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے، عام طور سے لوگ اِس قسم کے دعاوی کے اِتنے عادی ہو چکے تھے کہ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔

مندرجہ بالا اُمور کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر وجدانیات یا اندرونی مشاہدات کو بغیر کسی شرط کے مطلق سند مستند کے طور پر قبول کر لیا گیا تو اُسکی ابتدائی صورت مستقل طور پر اپنی جگہ حاصل کرے گی، اور ہم اِس ابتدائی دور مظاہر پرستی کی طرف لوٹ جائیں گے، جب کہ ہمیں ہر درخت میں ایک بھوت دریاؤں میں دیویاں، جنگلوں میں بھوتوں کے غول، اور چاند و سورج میں دیوی دیوتا نظر آتے تھے۔ اِتنا ہی نہیں بلکہ خطرہ ہے کہ ہم قدیم دہشت انگیز دور تک پہنچ جائیں، مذہبی تصورات نے یونان کو اپالو اور ایتھن دیا تو مغربی ایشیا والوں کو مولوچ بھی عطا فرما دیا، اور مایا کو اُن کا خون آشام مذہب

بھی بخشا ہے۔

ڈاکٹر اوٹو اپنی مشہور کتاب "تصورِ تقدیس" میں لکھتے ہیں:۔

"مذہب کی ابتدائی صورت خوفناک وخطرناک بلکہ بعض وقت انقلاب انگیز و باغیانہ ہوتی ہے۔ جس چیز کو موافق فطرت سمجھا جاتا ہے وہی بعد کو روز بروز نامناسب محسوس ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بالآخر اس کو یکدم ناکارہ قرار دینا پڑتا ہے۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ جب وجدانی احساسات کو ایک بار بطور سند تسلیم کر لیا گیا تو کبھی اُسے ناقابلِ استناد قرار دیا جا سکے گا؟

کیا لوگوں کو پھر اس کے لئے کسی دوسرے کشف و وجدان کا انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ کس طرح فیصلہ کیا جا سکے گا کہ جدید و قدیم میں سے کون قابل یقین ہے۔

ان تمام شکوک و شبہات میں ایک چیز بہرحال مسلم معلوم ہوتی ہے کہ کشف، وجدان، اور الہام کے دعاوی صرف اس لئے قبول نہیں کئے جا سکتے کہ "پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔"

یہی صورت ہوتی ہے اخلاقی حدود میں وجدان کی، اس وقت وجدان کو ہم لوگ ضمیر کی آواز بھی کہتے ہیں، مگر خود ضمیر بھی تو غلطی کر سکتا ہے۔

کہیں سے تاریخ عالم کے صفحات اُلٹیئے ایسے بہت سے کارنامے نظر آئینگے جو عظیم الشان اشخاص نے ضمیر کی آواز کے ماتحت انجام دیئے تھے، لیکن زمانۂ مابعد نے بالاتفاق ان کارناموں کو اعلیٰ درجہ کا ظلم اور وحشت طرازی قرار دیا ہر ستم رانی ضمیر کی آواز ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ نیز یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کا ضمیر ایک حکم لگاتا ہے، اور دوسرے کا اُس کے بالکل برخلاف حکم دیتا ہے، ایک شخص ہے کہ ہمیشہ تا دمِ مرگ کسی قانون، یا ضابطہ کو اپنے ضمیر کے خلاف

پاکر اس کی مخالفت کرتا ہے لیکن اُس جیسے دوسرے بہت سے افراد اسی ضابطہ کو بدیہی طور پر حق بجانب سمجھتے اور قبول کر لیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ بنی نوع انسان میں ایک ہی ضمیر ہے جو ہر فرد بشر میں کار فرما ہے، اور آزادی کے ساتھ خطا و صواب کی نشان دہی کرتا ہے تو لازماً ہر انسانی ذہن کی ایک ہی ساخت ہونی چاہیئے تھی، اور ہر مسئلہ پر یکساں جواب ذہنوں میں آنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی یکسانیت اور ایسا اتفاق کہیں موجود نہیں، نہ آج ہے، اور نہ کل موجود تھا۔ اِس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی شخص کا کسی فعل کے متعلق یہ یقین کہ اُسے کرنا چاہیئے یہ اُس کے ضمیر کا حکم ہے خود اُس فعل کے جواز کی کوئی دلیل ہے، ولیم جیمیس نے کیا خوب کہا ہے:۔

"علم باطن بہت زیادہ شخصی چیز ہے، پھر اس میں بہت تنوع بھی ہے، ممکن نہیں کہ اس کے متعلق کسی عمومی استناد کا دعوے کیا جا سکے۔"

موجودہ دور جسے یقین کے لئے مستحکم بنیاد کی تلاش ہے کسی باطنی تجربہ یا کسی شخص کے ضمیر کی حکمرانی کو تسلیم کر کے یہ بنیاد نہیں پا سکتا۔ اِستناد کو قابل تنقیح، اور فیصلہ کو قابل تنقید ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ ہم ایسی بنیاد کہاں سے لائیں؟

کبھی ایسا زمانہ تھا کہ قوت خود معیار بن جاتی تھی، عقیدہ، نہ قبول کرنیوالوں کو کچل کر منوالیا جاتا تھا، اور جب ایک عقیدہ اس طرح مان لیا جاتا تو وہ عقیدہ ربانی قرار پاتا تھا، لیکن موجودہ دور میں تم منکرین کو قتل کرنا تو کجا چپ بھی نہیں کر سکتے ——— اب جب کہ قوموں کا باہمی ربط بہت زیادہ قوی ہوتا جا رہا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکار جو کسی مقام پر کچل دینے کے قابل قرار پاتا ہے، وہی انکار

دوسرے مقام پہ ایک عقیدہ بن کر دوسروں کو کھل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قوت دلیل صداقت نہیں ہو سکتی۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ عجائبات و خرق عادت سے دعوائے کشف کی تصدیق ہو جاتی تھی، یہ مُہر جس دعویٰ پر لگ گئی اُسے مصدقہ قرار دے کر مان لیا جاتا تھا۔

خرق عادت عموماً چار قسم کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِن چاروں اقسام کے اندر تمیز کرنا بڑا اہم کام ہے۔

(۱) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو فطرت کے عام مقرر کردہ ضابطہ سے بالکل مخالف ہو، مثلاً کوئی مادی چیز بدل کر دوسری چیز ہو جائے، اور اُن دونوں کے مابین کوئی کیمیاوی رابطہ موجود نہ ہو، جیسے بیل اور آم کا درخت، یا لکڑی اور سانپ۔ یا جیسے کوئی پتھر کا بت حرکت کرنے لگے یا گفتگو شروع کر دے۔

(۲) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو بہ ظاہر تو ضابطہ فطرت کے مخالف معلوم ہو، لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ مثلاً کسی مریض کا فوری جذبہ یا چوٹ کے ذریعہ یا کسی دوسرے شخص کے اثر کے ماتحت شفا پا جانا۔

(۳) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جو اگرچہ ضابطۂ فطرت کے خلاف نہیں مگر اُس خاص وقت میں خلاف ضابطہ معلوم ہوتا ہو، مثلاً بارش کے لئے دعا کی گئی، اور فوراً بارش ہو گئی۔

(۴) کسی ایسے واقعہ کا ظہور میں آنا جس کا کوئی تعلق حدود عالم طبیعیات سے نہ ہو، مثلاً بیرون عالم مادہ سے تلقی علم یا ارواح کی حاضری وغیرہ۔

پہلی تینوں قسموں کے متعلق تو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈھ کر وجوہ و اسباب نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً قسم اول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کافی شہادت موجود نہیں

اور اگر ہو بھی تو یہ معمولی نظر بندی سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتا اکثر ایسے واقعات نظر کے دہوکے ہوتے ہیں۔ قسم دوم کے متعلق صورت بالکل واضح ہے ہاتھ پھیر دینے یا پھونک دینے سے کسی شخص کا صحت یاب ہوجانا کوئی تعجب خیز بات نہیں، مختلف جذبات پیدا کرکے نفسی علاج ہوسکتا ہے، مشہور ہے کہ "ایک گھنٹہ کی خوشی سو روپیہ کی دَوا سے بہتر ہے۔" دوسرے انسان کی قوت کا اَثر بھی پڑتا ہے، اور نفسیات میں یہ بارہا کا تجربہ کیا ہوا مسئلہ ہے، قسم سوم کے متعلق جب تک یہ معلوم نہو کہ یہ واقعہ اتفاق تھا یا دعا، کا اثر، معاملہ واضح نہیں ہوتا۔ جب بار بار ایسا ہی واقعہ ظہور پذیر ہو تب البتہ اسے خرق عادت کہا جاسکیگا لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

اصل معاملہ چوتھی قسم کا رہ جاتا ہے۔ جو لوگ فطرت کے عام مقرر کردہ ضابطہ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُس میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ اِس پر طرح طرح کے شکوک وارد کرتے ہیں جن میں ناکافی شہادت، اور بیان کا ردوبدل وغیرہ داخل ہے، دیکھنے کی غلطی کو بھی ممکن قرار دیکر خرق عادت کو ختم کردیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاتما بدھ سب نے اپنے پیروؤں کو عجائبات سے متاثر ہوجانے اور خرق عادت کو دلیل صداقت کے طور پر قبول کرنے سے منع کیا ہے۔ اگر یہی وجہ صداقت کی ہو تو مداری کے تماشہ سے اس کی باتیں مبنی بر صداقت کیوں نہ قرار پائیں۔

وجدان کی صحت کے متعلق فیصلہ کن چیز کسی مذہبی مجلس کا بیان، یا کوئی مقدس کتاب بھی نہیں ہوسکتی، کسی مذہب کی مقدس کتاب کا ہر جزو موجودہ دنیا کے تمام اشخاص کے لیئے قابل قبول نہیں ہے۔ بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ؎

کسی کلیسا کو مقام اِستناد اگر دیا جائے تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خود اِس کلیسا کی بنیاد کس چیز پر ہے، جواب میں وہی لفظ وجدان آجائے گا، نیتجۃً ہم منطقی دور میں مبتلا ہو جائیں گے، کلیسا کی بنیاد کشف و وجدان پر اور کشف و وجدان کی بنیاد کلیسا پر۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عام بنی نوع اِنسان کی رضا مندی کو معیار قرار دیا جائے، ڈھونڈھ کر وہ نقطہ نکالیئے جس پر سب لوگ متفق ہو سکیں، اور اُس میں حقیقۃً خدا کی آواز بھی شامل ہو —— چند سادہ اخلاقی تصورات کے علاوہ کوئی اُصول مذہب ایسا نہیں ہو سکتا جو بدھ مت اور کنفیوشیت کے لئے قابل قبول ہو حالانکہ دنیا کی ایک تہائی آبادی اُن ہی دونوں مذاہب کے پیرؤں پر مشتمل ہے؛ اور اگر ان دونوں کو خارج بھی کر دیجئے پھر بھی مسلمان، عیسائی، یہودی اور ہندو بنیادی اُمور میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں؛

بعض لوگ ایک حل یہ نکالتے ہیں کہ سائنس اور مذہب کے حدود ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ سائنس کے حدود میں اِستدلال و فراست کام کرتی ہے اور مذہب کے حدود میں وجدان و کشف، لیکن معمولی تحقیقات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔ سائنس دان کا دماغ بھی وجدان سے کام لیتا ہے اور مذہبی کا دماغ بھی استدلال و فراست سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

اِس پر بحث مفید نہیں کہ اِستدلال و وجدان میں سے اولیت کا مرتبہ کسے حاصل ہے، یہ کہنا کہ استدلال و فراست ہی اولی ہے، کمال درجہ نادانی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وجدان جو انسانی اعمال پر بڑی حد تک حکمرانی کرتا ہے محض خادم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح یہ کہنا بھی دانائی نہیں کہ "بالآخر وجدان ہی کی پیروی کرنی پڑتی ہے"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِستدلال و فراست سے غلطی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ غلطی ہوتی ہے، اس کی مثالیں اخلاق و سیاست کے معاملات میں بارہا ملتی ہیں، فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ اخلاق کے گہرے مطالعہ اور تاریخ کی چھان بین سے بار بار کلی اصول مرتب کئے جاتے ہیں، لیکن عمل میں آنے کے بعد یہ غلط اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں، البتہ ایک اُصولی فرق فراست و استدلال کی غلطی اور وجدان کی غلطی کے مابین ہے کہ فراست کی غلطی دوبارہ فراست کی تحقیقات میں ظاہر ہو جاتی ہے، اور اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ لیکن وجدان کی غلطی معلوم کرنے کا خود وجدان کے پاس کوئی راستہ نہیں، اس کی صرف ایک سبیل ہو سکتی ہے کہ وجدان کو استناد مطلق کے مرتبہ سے ہٹا دیا جائے اور فراست کو موقع دیا جائے کہ وجدان سے جو غلطی ہو چکی ہے، اُس کی اِصلاح کر دے، اِس طرح فراست و استدلال اخلاق، سیاست اور مذہب میں وجدان کی غلطیوں کو درست کر سکتا ہے؛

اب ہم اپنی بحث کو ختم کرتے ہیں، سوال یہ تھا کہ سائنس کی تھکا دینے والی راہ کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، کیا ہم صداقت کاملہ تک وجدان و علم باطن کے پروں پر اُڑ کر نہیں جا سکتے، بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم مجبوراً یہ کہتے ہیں کہ وجدان و علم باطن کے ذریعہ کسی اچھے نتیجہ تک پہنچنے کی ہم اُمید نہیں کر سکتے۔ پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

وجدان اِنسانی دماغ کے اندرونی اعمال کا ایک جزو ہے، علم باطن اور الہام کا امکان ہے، سائنس کو اس سے اِنکار نہیں، لیکن الہام کا ہر دعویٰ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ضمیر کی آواز، اور وجدان کو قابل اِعتماد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کھرے کھوٹے کی تمیز کے لئے کوئی فیصلہ کن چیز ہونی چاہیئے۔ یہ فیصلہ کن چیز کامیاب مظاہرۂ قوت یا خرق عادت کا ظہور نہیں ہو سکتا، خرق عادت میں سے بعض واقعات تو حقیقتہً خرق عادت نہیں ہوتے، اور جو واقعتہً خرق عادت کہے جا سکتے ہیں، اُن کے لئے

کافی شہادت موجود نہیں جو انکار پر غالب آ سکے، یہ فیصلہ کن چیز مجالس مذہبی یا مقدّس کتب بھی نہیں ہو سکتی ہیں کیونکہ اول تو کسی مقدس کتاب پر اتفاق نہیں، دوسرے خود ان کی بنیاد بھی دعویٰ زیر بحث پر قایم ہے۔ یہ فیصلہ کن چیز تصدیق عام بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ تصدیق عام نہیں پائی جاتی، پھر کسی انکار کے مقابلہ میں عام تصدیق کیونکر پیش کی جا سکتی ہے، اگر کسی خاص وقت میں تصدیق عام بھی ہو جائے تو زمانہ مابعد کے لئے وہ سند نہیں رہتی۔

مذہب کو علوم طبعیہ سے بالکل علیحدہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، ایک کو وجدانیات اور دوسرے کو فراست سے متعلق کرکے ایک دوسرے سے بالکل جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کوئی وجہ ہے کہ وجدان کو فراست سے یا فراست کو وجدان سے بلند مرتبہ عطا کیا جائے ـــــ ان دونوں میں ایک فرق البتہ موجود ہے وہ یہ کہ غلطی تو وجدان و فراست دونوں ہی سے ہو سکتی ہے لیکن فراست کی غلطی کی خود فراست ہی سے اصلاح بھی ہو سکتی ہے مگر وجدان کی غلطی کی اصلاح کی کوئی سبیل نہیں بجز اس کے کہ پھر فراست سے کام لیا جائے۔

چھٹا باب

مذہب کی معقولیت

مذہب کی معقولیّت

ہر شخص جو دنیا میں امن و سکون کا آرزومند ہے اور چاہتا ہے کہ زمانہ کے انتشار سے نجات پانے کی کوئی راہ دریافت کرے اور یہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جدید علوم اور قدیم خیالات کے مابین اتفاق و اختلاف دونوں موجود ہیں، اُسے غور کرنا چاہیئے کہ وہ مذہب کو کیسا بنانا چاہتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلو کہ عقاید ناقابل تبدیل نہیں ہیں، ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، لیکن تغیر کس نوعیت کا ہو؟ ایک نسل آگے بڑھادیں، ایک صدی آگے بڑھادیں، آخر مذاہب کو ہم کہاں پہنچانا چاہتے ہیں؟

قدیم مذاہب مختلف قسم کے اجزا کا مجموعہ ہیں، اُن میں کائنات کی تشریح کرکے اس میں انسان کا مقام واضح کیا گیا ہے۔ اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا گیا ہے، پھر دلائل دئے گئے ہیں کہ کیوں ہمیں اس ضابطہ کی پیروی کرنی چاہیئے اس میں انسانی عواطف کے لئے راہ عطا کی گئی ہے، ان میں بیکسی کے عالم میں استعانت اور مصیبت کے وقت میں نجات کے لئے وسیلہ بتایا گیا ہے (ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کس طرح اپنے نیک خیالات کو قوی کرکے برے جذبات سے مقابلہ کرسکتا ہے) — اور ان سب کے علاوہ ایک ایسے معبود کا تصور پیش کیا گیا ہے جو بہ یک وقت خالق بھی ہے، اور فعال مطلق بھی، جو قانون

دہندہ بھی ہے، اور عادل و منصف بھی، جو سرپرست بھی ہے اور حبیب بھی۔
علماء دینیات اس کے لئے تیار ہیں کہ خدا کی ذات اور اس کے افعال سے متعلق نہایت قابلِ اعتماد تفصیلات بتائیں، اُس کی رضا یہ ہے، اُس کا ارادہ یہ ہے، اُس کے صفات یہ ہیں وغیرہ وغیرہ متی ارنلڈ کی زبان میں "جیسے خدا اگلی سڑک پر موجود کوئی شخص ہے"۔ اگر تمام مذاہب یا ایک مذہب کی کتب مقدسہ کے تمام اجزاء کو ہم الہام تسلیم کرکے قبول کر لیں یا اولیاء و علماء باطن کے مشاہدات کو مان لیں، تو بلا شبہ اس قسم کی تفصیلات کے لئے گنجائش مل جاتی ہے۔ لیکن ہم ان سب کو بلا چون وچرا تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ایسا کرنے سے ہم تضاد میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور ہمیں ایسی باتیں ماننی پڑتی ہیں جو حقیقتاً صحیح نہیں ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ عقل و فراست کی رہنمائی میں اُن مشاہدات اور کشوف کی تفصیلات میں انتخاب کا عمل کریں —— اب جیسے ہی ہم یہ عمل شروع کرتے ہیں، ہمیں ایسی آزاد دانش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو کسی خصوصی کشف و رؤیا کی پابند نہ ہو، اس وقت یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ہمارے وہ مقدمات معلومہ جن پر ایسے علم کی بنیاد ہو گی کتنے ناقص ہیں۔
اُصول علت و معلول ہماری اُمید کا واحد مرکز ہے، اگر یہ کائنات معلول اور خدا علت ہے تو ذات علت اگرچہ پوری طرح نہیں لیکن بہر حال کسی قدر ذات معلول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ راگ سے مغنی پر، تصویر سے مصور پر، فکر سے مفکر پر اور کائنات سے خالق کائنات پر ہم استدلال کر سکتے ہیں۔ اسپنوزا کہتا ہے کہ "جیسے جیسے ہم معلولات کو سمجھتے جائیں گے، خدا ہماری سمجھ میں آتا جائے گا"۔ اور چونکہ کائنات میں عقل موجود ہے اس لئے خدا میں بھی یقیناً عقل ہونا چاہیئے۔

انسانی عقل، ارادہ و مقصد رکھتی ہے، اس لئے یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ خالق کائنات بغیر اُن صفات کے ہوگا۔ یہ خیال کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ افعال فطرت کے پیچھے کوئی مقصد و ارادہ موجود نہیں ہے۔

کیا ہم اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ انسانیت کی تاریخ اور موجودہ تہذیب میں ذات خداوندی سے متعلق کوئی اور تفصیل مل سکتی ہے؟

جو مفکرین اصول علت و معلول کو تسلیم کرتے ہیں، اور وجود خالق کو اولاً اور عقل، ارادہ اور مقصد کو اس کے توابع کے طور پر مانتے ہیں، اُن میں خدا اور عالم کے باہمی تعلق سے متعلق چار قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

(۱) ایک وہ طبقہ ہے کہ جو خدا کو ایک تاریخی شخصیت مانتا ہے، ایک مرتبہ ماضی بعید میں خدا نے عالم کو پیدا کر دیا تھا، اس کے بعد خود عالم میں ایسے قوی موجود ہیں جو کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ دنیا کا کام چلتا رہتا ہے۔

(۲) ایک خیال یہ ہے کہ خدا نے فطرت کے قوانین مرتب فرما دیئے ہیں، اور دائماً فعال و نگران بھی ہے کبھی کبھی وہ دُنیا کے معاملات میں دخل بھی دیتا ہے، اس خیال کے لوگوں میں سے بعض کسی ایک پیغمبر یا متوسط کے ذریعہ فعالیت کو مانتے ہیں، بعض وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی متعدد برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ، اور بعض یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ فطرت کے قانون مستمرہ میں مخصوص و متواتر عمل ارادہ کے ذریعہ کار فرما ہے۔

(۳) تیسری جماعت وہ ہے جو کہتی ہے کہ خدا ہر وقت، ہر جگہ اور ہر چیز میں کار فرما ہے۔

(۴) چوتھی جماعت "ہمہ اوست" والوں کی ہے، ان کے نزدیک خدا اور کائنات کے مابین دوئی نہیں ہے یہ لوگ خدا کو خارج میں تسلیم نہیں کرتے

اور یہ بھی نہیں مانتے کہ خدا اِس کائنات کے علاوہ کچھ اور ہے — جدید علوم میں اس کی مثال تلاش کیجئے تو یوں سمجھئے کہ خدا اور اس عالم عقل و مادہ کے مابین تعلق ایسا ہے جیسے ایک ذی روح جسم اور کروڑوں خلیات میں ہے۔ ہر خلیہ انفرادیت رکھتی ہے لیکن پورے عضویاتی نظام سے کسب حیات کرتی ہے۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ دُنیا کو دیکھ کر ہم خدا تک راہ حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، تو ہم ہر اُس عمل کو جو ہمارے اِس کرۂ ارضی پر وقوع پذیر ہوتا ہے خدا کا فعل سمجھ کر کہتے ہیں۔ اِس جھگڑے کو رہنے دو کہ خدا اور کائنات کا تعلق کس طرح کا ہے۔ تخلیق کائنات کے بعد خدا نے اپنے آپ کو بالکل الگ کر لیا ہے، یا خدا موجود ہے لیکن فعل کبھی کبھی اس سے صادر ہوتا ہے یا وہ ہر وقت و ہر چیز میں ہر جگہ کارفرما ہے یا کائنات عین خدا ہے، چاروں صورتوں میں اِس پر بہرحال اتفاق ہے کہ اس ساری کائنات کا خالق مُطلق خدا ہی ہے۔ آخری اختیار اُسی کا ہے، اور آخری اختیار ناقابل تقسیم ہے کیونکہ کوئی دوسرا موجود نہیں جو اس کے اختیارات میں شریک ہو۔ خدا یا تو سب اختیار رکھتا ہے یا پھر کوئی اختیار نہیں رکھتا، اگر ایک بھی ایسا تسلیم کیا گیا جس کو کچھ اختیار حاصل ہو تو سب کو کچھ نہ کچھ اشتراک حاصل ہو جائے گا۔

اِس مسئلہ پر کون یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا چاروں خیالات میں سے واقعہ سے تطابق کس کا ہوتا ہے، اور کس کا نہیں ہوتا۔ یہی حال ہے انسانی رُوح کی حقیقت، اور اس کے لازوالی ہونے یا نہ ہونے کا مذہب کی دُنیا میں عدم یقین کی بڑی بہتات ہے۔ دلائل و براہین کے ساتھ مختلف خیالات کی بڑی گنجایش موجود ہے ہر اختلاف کسی نہ کسی مذہب میں مستند

قرار پا سکتا ہے۔

اصول مذہب میں اتفاق کے باوجود پیش کرنے کے طریقہ میں اتنا اختلاف ہے کہ پوری دنیا ئے انسانیت کے لئے ایک مذہب تیار کرنا ممکن نہیں۔ یہ محض حماقت ہوگی کہ ایک معیاری مذہب کی تلاش کی جائے جس کے عقائد و اعمال سب کے لئے قابل قبول ہوں۔ مستقبل میں کبھی اگر عقائد میں تقرب پیدا ہوجائے پھر بھی یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ اختلافات بالکل ختم ہو جائیں گے۔

دوم:- کسی مذہب کے اثر انداز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جماعتی ہو، اس کا دستور اجتماعی ہونا چاہیئے جس میں فطرت کے اصول کی گنجائش بھی موجود ہو، زیادہ لوگ وہی ہیں جو محتاج ہیں کہ کسی تنظیم کے ذریعہ اُن کے سامنے ایک نظام اعتقاد پیش کیا جائے، غیر معمولی مفکر اپنے عقائد خود ہی بنا سکتا ہے، وہ کلیساؤں کے احکام کی پیروی بھی کرسکتا ہے اور ایک جدید کلیسا بنا بھی سکتا ہے۔ لیکن تہذیب کے موجودہ درجہ میں ——— ایک معمولی آدمی محدود معلومات اور فرائض معاش کے دباؤ میں کہاں بنا سکتا ہے؟

ہزاروں مرد اور اُن سے زیادہ عورتیں نمازوں میں اطمینان قلب محسوس کرتی ہیں، اگرچہ ایک ملحد کو یہ نمازیں خود اشاریت سے زیادہ کچھ نہ نظر آتی ہوں لیکن اس کا ہر شخص اقرار کرے گا کہ عبادت کرنے والے کے لئے یہ نمازیں ذہن کو نیکی کی طرف پھیر دینے والی چیزیں ہیں۔

سوم:- مذہب کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جذبات کی تکمیل کے لئے کوئی نہ کوئی راہ دے۔ مذہب شعر کو روح انسانی کی خدمت کے لئے اختیار کرتا ہے، شعر مذہب کے لئے روایات کا ایک جال بن کر تیار کرتا ہے، مظاہر بناتا اور رسوم و اعمال مذہبی کی طرف رجحان پیدا کرتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو فنِ تعمیر

موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی امداد کرتا ہے ـــ مذہب زمانہ ماضی میں اپنی پاک زندگیاں بسر کرنے والے پیغمبروں، ولیوں، اور شہداء سے ہمارا ربط قایم رکھتا ہے، ان بزرگ لوگوں سے ہماری ملاقات کراتا ہے جنھوں نے روحانی امور کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں تک قربان کردی تھیں، اس طرح مذہب ہمیں ہزار ہا سال کی روایات سے جو اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، اس کے ماتحت لے آتا ہے۔ ہمارے حاضر کو شاندار ماضی سے اور مستقبل کو ہمارے حاضر سے جوڑ کر مذہب انسانیت کی تاریخ میں ایک ربط پیدا کر دیتا ہے۔ عشاء ربانی جس میں بار بار شعر آتا رہتا ہے زندگی کے معمولی واردات مثلاً محبت، شفقت، ولادت، وفات وغیرہ میں شکوہ، اور قلوب کو سکینت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کبھی کوئی فلسفہ مذہب نہیں بن سکا۔ فلسفہ نصب العین و یقین کی طرف رہنمائی تو کر سکتا ہے، لیکن خود نہ یقین بن سکتا ہے اور نہ نصب العین، کیا خوب کہا گیا ہے کہ:ـ

"فلسفہ کی فنی اصطلاحات انسانی جذبات کو چھیڑنے میں
بالکل ناکام ہیں اُن کی آواز ہماری روح کی دنیا تک نہیں پہنچتی،
اور نہ کوئی گونج پیدا ہوتی ہے ـــ فلسفہ ذہنی تصورات سے
زیادہ کوئی زندہ خیال نہیں پیدا کرتا۔"

ایک فلسفی کے نزدیک یہ کائنات اور یہ سطح انسان کا ماحول ہے اور بس؛ لیکن ایک عام آدمی کے لئے اس کا ماحول ہی اس کا گھر ہے، اس کا خاندان ہے، اس کا شہر ہے، اس کا ملک ہے، اور اس کی دنیا ہے۔

فلسفہ شعر نہیں ہے، یا یوں سمجھئے کہ فلسفہ کو شعر نہیں ہونا چاہیئے، اگرچہ یہ سچ ہے کہ بہت سے فلسفیوں کو اپنے فلسفیانہ نظریوں کے دلفریب بنانے کیلئے

اُس میں شعریت پیدا کرنے کی تمنا رہی ہے، اور بہت سے فلسفیوں نے اِس تمنا، کو پورا کرنے کی سعی بھی کی ہے، سب سے قدیم اَفلاطون، اور سب سے جدید برگسان کا نام اِس سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی فلسفہ، فلسفہ ہے، اور شعر، شعر —— بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کی نظر فلسفی کی نظر سے زیادہ عمیق ہوتی ہے، اور بعض وقت واقعی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اِن دونوں کے حدودِ نظر کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہی رہنا چاہیئے۔

شعر ذہنی مواد سے شاندار و دلفریب ڈھانچہ تیار کر سکتا ہے۔ فلسفہ نہیں کر سکتا اُس کے لئے مواد کا ٹھوس ہونا ضروری ہے، اس کو مشاہدہ، سائنس اور فراست کی حاجت ہے۔

اسی طرح شعر کا مقابلہ سائنس سے کیجئے، وہ اِحساس جو سائنس دان کو حرکت میں لاتا ہے، ممکن ہے کہ کسی معنی میں شاعرانہ اِحساس کہا جا سکے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سائنس کے اِکتشافات میں شاعری کے لئے کوئی سامان میسر آجائے لیکن پھر بھی شعر سائنس نہیں ہے اور سائنس شعر نہیں ہے۔

شعر ہم سے فلسفہ و سائنس کی دنیا میں جُدا ہو کر مذہب کی دنیا میں دوبارہ مِل جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو، کہ

مذہب اَولاً متنوع ہے، دوم ہم آہنگ ہے، سوم جذبات پرور اور شعریت سے پُر ہے تو پھر قدیم عقائد سے اِختلاف کہاں ہوا؟

میں یہ پہلے بتا آیا ہوں کہ دعوائے کشف کی تنقیح میں فراست سے کام لینا چاہیئے اوہام کو مذہب بنا کر قبول کر لینا صحیح نہیں ہے، شعریت اپنی موثر قوت کے باوجود علم کی تباہی کا سبب نہ بننے پائے۔ ایک صحیح ذہن کبھی خلاف واقعہ امر کو یقینیات میں جگہ نہیں دے سکتا۔ صداقت کو بہر حال اول درجہ پر ہونا چاہیئے۔ اگر یہ سب کچھ

کیا گیا تو بہت کچھ اختلاف پیدا ہو جائے گا۔
ابتداءِ کائنات سے متعلق وہ روایات جو آج مختلف مذاہب میں موجود ہیں، اُن میں سے موجودہ علوم کے نزدیک جو بالکل ناقابل قبول ہیں، آئندہ باقی نہ رہ سکیں گی خرقِ عادت اور کشف و کرامات کو وہ درجے نہیں دیئے جائیں گے جو آج دیئے جاتے ہیں۔
مختلف مذاہب میں جو علم الاصنام اور افسانے پائے جاتے ہیں، اُن کو صرف دیومالا اور افسانے ہی سمجھا جائے گا۔ آج کی طرح آواگون اور تناسخ کا چکر باقی نہیں رہیگا۔ یہ طریقہ جاری نہ رہ سکے گا کہ سادہ مزاج لوگوں کو دیومالا سُنا کر اُس پر یقین رکھنے کو کہا جائے۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ مذاہب ناقابل تبدیل نہیں ہیں۔ بہ ظاہر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سے عقائد میں بغیر اُن کی رُوح کو نقصان پہنچائے بھی مناسب ترمیم ہو سکتی ہے۔
تاریخ شاہد ہے کہ تمام مذاہب میں ضروریات زمانہ کے مطابق ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں، اگرچہ یہ ترمیمیں اصول میں نہ ہوں مگر فروع اور اعمال میں یہ ترمیمیں ہوتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب میں آج بھی ایسی ترمیمیں جاری ہیں۔
اِن ترمیموں کے بعد یہ موقع نہیں رہے گا کہ محض اوہام کی بنا پر اَخلاق انسانی کی ترقی رُک جائے۔ یا دین کے نام سے پیشہ ور مذہبی جماعتیں برسرِ اقتدار نظر آئیں اور معاشرتی ترقی میں حارج ہوں۔ مذہب اس وقت اِنسان کے لئے افیون نہیں بلکہ ایک مقوی دوا ہوگا۔ اس وقت مذہب کو ایک تاریخی چیز نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت سمجھا جائے گا — تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے والے ختم

ہو جائیں گے، بنی نوع انسان کو عظمت و سربلندی حاصل ہو گی، اس وقت انسان دنیا میں قدرت کے نظام العمل کی تکمیل کو دیکھنے والا ہی نہیں ہو گا بلکہ قدرت کا نظام العمل خود اسی کے ہاتھوں سے تکمیل پائے گا ــــ مذہب آج کی طرح روزانہ کی زندگی سے غیر متعلق چیز نہ ہو گا، بلکہ ہر انسانی گھر، اور حکومت میں بھی پھر سے واپس آجائیگا۔

جب مذہب اوہام، و تصورات اور ممتنعات کا مجموعہ نہ ہو گا، بلکہ خود سائنس و فلسفہ کی طرح عقل و استدلال سے کام لیتا ہو گا تو ہمارے خیالات بھی مذہب کے مخالف نہ ہوں گے۔ اس وقت کرسوپ لیک کی زبان میں "مذہب کسی محقق کے ذہن سے اُلجھے بغیر عابد کے قلب کو سکینت عطا کر سکے گا۔"

خود مذاہب کے مابین جو ایک رواداری پیدا ہو جائے گی وہ بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتی، تمام مذاہب کی ایک ہی راہ اور ایک ہی مقصد ہو گا۔ مذاہب ایک دوسرے سے اچھے اجزاء قبول کر سکیں گے، اور ان میں باہمی دشمنی کی بجائے اتحاد زیادہ کام کرے گا۔ [۱]

---

[۱] فاضل مصنف کا مطالعہ مذاہب چونکہ بڑی حد تک ناقص ہے، اس لئے جب وہ مذاہب کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اس وقت اُن کے اپنے مذہب یا برِّاعظم یورپ کے عمومی مذہب، عیسائیت کا نقشہ سامنے رہتا ہے۔ معقولیت اور عقلی ترمیم سے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ یقیناً مذہب عیسائیت کے لئے ضروری ہو گا، کیونکہ عیسائیت خرافی روایات، اوہام، رسوم اور کشف ربانی کے تصص سے پُر ہے، مذہبی ادارے ہیں جو اختیارات کلی کے ساتھ کار فرما ہیں۔ پرنیسٹ ہوڈ (مذہبی مقتدر طبقہ کا وجود) عیسائیت اور ہندو دہرم وغیرہ کی جان ہیں۔ اس طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ جو عقیدہ چاہے یقین کے لئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ پیش کر دے اور جس پرانے عقیدہ کی چاہے من مانی تشریح و تفصیل بیان کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علوم عقلیہ اور جدید تجربات سے ٹکر ہو جاتی ہے۔

ہر دانشمند آدمی کو یہ تسلیم ہے کہ مجرد دعوائے کشف والہام قابل قبول نہیں ہو سکتا، اور مسلمان صوفیاء کا تو اس پر اتفاق ہے کہ کشف والہام باطن قابل استناد نہیں ہیں، کسی وقت اسے بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ خرق عادت و عجائبات سے مرعوب ہو جانے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ کسی مذہب کے فروع ناقابل تبدل ہوں تو ہوں، اسلام نے اس بارے میں جس قدر گنجایش فکر انسانی کے لئے رکھی ہے اس کے لئے فقہا و مفتین کے فتاوی شاہد ہیں۔ مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں علم کلام کی پیدایش ہی اسی وسعت کی رہین منت ہے۔ علوم جدیدہ سے اسلام کی کہیں ٹکر نہیں ہوتی، اگرچہ ہم اس اصول کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ جو کچھ جدید عصری اکتشافات کے سامنے ناقابل قبول ٹھہرے اسے ٹھکرا دیا جائے۔ خود مصنف بھی چوتھے باب میں ثابت کر آئے ہیں کہ انسانی علوم ابھی تک اس قدر ناقص ہیں، اور ہر نظریہ اس قدر غیر یقینی ہے کہ اس کو ہم کسی یقین کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے، ملاحظہ ہو باب چہارم۔ لیکن پھر بھی یہ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے انسانی عقل و بصیرت کے لئے پرواز کی پوری وسعت مہیا کی ہے۔ اس نے کسی ایسی چیز کے ماننے کا حکم نہیں دیا جو عقل انسانی کے نزدیک صریحاً ناقابل قبول قرار پائے۔ عقل و فہم میں معیار کس کی عقل و فہم ہے؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ لیکن اسلام نے تو انفرادی فہم و ادراک کو بھی غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ضروریات و حالات زمانہ کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ ساتھ دیتا رہے گا۔

بقیتہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فاضل مصنف نے مذہب کی تشکیل جدید کے بعد جو اس کی خیالی صورت پیش کی ہے، اسلام کی آج بھی وہی صورت ہے اور وہی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتا ہے جس کی مصنف کو آرزو ہے۔ مثلاً ابتداء کائنات سے متعلق جو روایتیں جدید علوم کے نزدیک ناقابل قبول ہیں وہ باقی نہ رہیں گی۔ اسلام میں کوئی روایت ابتداء کائنات کے متعلق ایسی موجود نہیں۔ خرق عادت اور کشف وکرامات کو استناد کا مرتبہ نہ عطا کیا جائے ــــ اسلام میں خرق عادت، کشف وکرامات تو الگ رہا خود معجزہ کو بھی دلیل نبوت نہیں قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ عجائب سے متاثر نہ ہونے کا حکم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، جیسا کہ خود مصنف اسی باب میں بیان کر چکے ہیں ــــ اسلام میں "دیومالا" علم الاصنام کا وجود نہیں، عقیدۂ تناسخ اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام میں اوہام ورسوم کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بعض دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں رسواج کو اہمیت حاصل نہیں ہے، اور نہ عقلی استدلال کو حرام قرار دے کر اوہام کی اتباع کا حکم ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جس میں انفرادی، عائلی، اور اجتماعی زندگی سب کا نقشہ موجود ہے، عیسائیت کی طرح قوانین سیاست اور ضوابط معاملات سے خالی نہیں ہے، اسلام نے انسان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ مصنف کی تمنا کے مطابق تقدیر خداوندی خود اسی کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے ۔۔۔ دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(اقبال رح)

آخری فائدہ جو مصنف کو اپنے جدید مرممہ مذہب میں نظر آتا ہے وہ مذاہب کی باہمی رواداری ہے۔ یورپ والوں کے ہاں رواداری نام ہے منافقت اور بے اصولی کا، اور اسلام میں رواداری نام ہے آزادی عمل عطا کرنے کا، اس دوسرے معنی میں دیکھئے تو کسی خالص اسلامی آبادی میں ایک فرد عیسائی بھی اپنے مذہب کے تمام فرائض انجام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دے سکتا ہے، اور اسلامی ماحول میں اُسے وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے جو کسی دوسرے فرد مسلمان کو وہاں حاصل ہوں، عراق کی پارلیمان کے ایک عیسائی ممبر نے ۱۹۳۶ء میں تقریر کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ دنیا میں کسی قوم کا سینہ مسلمانوں کے سینہ سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا، پچھلے تیرہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے۔ لیکن رواداری کا دوسرا مفہوم جو یورپ والوں کے سامنے ہے یہ ہے کہ انسان دنیا کے تمام مروجہ مذاہب کو حق و صداقت کا حامل سمجھ لے، اور اُن کے اعمال و افکار میں شریک ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی بے اُصول، جاہل و بے مقصد انسان ہی سے یہ ممکن ہے۔ سچا اشتراکی سرمایہ دار کے ہاں تقریب مسرت میں بھی شرکت گوارا نہیں کر سکتا، تو ایک سچا مسلمان دیوالی، یا کرسمس میں شرکت کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟ مذاہب کا آپس میں ایک دوسرے سے اچھی باتیں اخذ کرنا، یقیناً اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ تاریخ ادیان کا گہرا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ دین پہلے وطنی تھا، جیسے مصریوں کا دین، ہندوستانیوں کا دین، بابلیوں کا دین وغیرہ، اس کے بعد نسلی ہوا جیسے یہودیوں کا دین، اور زرتشتیوں کا دین، پھر اسے پرائیوٹ یا نجی بنا دیا گیا جیسے عیسائی مذہب کی وہ شکل جو پولوس اعظم اور دوسرے بزرگان مسیحیت کے کشوف و الہامات کی آمیزش کے بعد تیار ہوئی ہے۔ آخر میں دین خالص انسانی یا بنی نوع انسانی کا ہو گیا، جو نہ کسی وطن کے ساتھ مخصوص ہے۔ نہ نسل کے ساتھ اور نہ ایک شخص کا انفرادی معاملہ ہے، غور کر کے دیکھئے تمام پرانے مذاہب کی خوبیاں اس میں اکٹھا کر دی گئی ہیں، اس میں مصری، ہندوستانی، یہودی عیسائی اور زردشتی مذاہب کی تمام اخلاقی خوبیاں مل جائیں گی۔

ہم مسلمان ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   اُمتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایمان ہو گئیں

بہرحال! اگر مصنف کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اور ہمارا ایقان ہے کہ ایک دن ہو گا۔

کہ تمام مذاہب کے ماننے والے عقل و فراست کو کام میں لاکر اپنے عقاید میں مناسب ترمیم کریں گے تو اُس دن ایک عالمگیر اتحاد قایم ہو جائے گا کیونکہ آخری ترمیم کے بعد ان کے عقاید و اعمال عین اسلام کے عقاید و اعمال ہو جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کے قول کے مطابق توحید ہو گی، دیو مالا ختم ہو جائے گی، اوہام ختم ہو جائیں گے، خدا کو مع صفات کے مانا جائے گا، عابد کو مذہب سکینت بخشے گا، اور محقق کے ذہن سے نہ اُلجھے گا۔ تناسخ کا چکر ختم ہو جائے گا مذہب کے ٹھیکہ دار ادارے ختم ہو جائیں گے، پیشہ ور مذہبی جماعت نہ ہو گی، معاشرتی اور علمی ترقی میں مذہب حارج نہ ہوگا، صداقت کو سب سے اعلیٰ درجہ عطا کیا جائے گا۔ مذہب افراد اور حکومت دونوں پر حاوی ہوگا ——— تو آخر اسلام اور کس نظام کا نام ہے؟ لے دے کے اقرار رسالت رہ جاتا ہے، تو سارے اقوال کو صداقت پر مبنی اور حق باور کرنے کے بعد کوئی حواس باختہ ہی ہوگا جو ان اقوال کے کہنے والے کو سچا نہ باور کرے۔

(ہاشمی)

ساتواں باب

شدائد و مصائب

شر اور مصائب

ہمارے دماغ میں یہ سوال آیا کہ کیا ہم انسانی تجربات کی روشنی میں خدا کا کسی قدر تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن معاً یہ سوال بھی پیدا ہو گیا کہ ساری دنیا، اور ہر عہد کے انسانوں کے دل و دماغ کو جس مسئلہ نے تباہ کر رکھا ہے وہ ہے مصائب اور شر کے وجود کا مسئلہ۔ یہ ایک قدیم سوال ہے۔

ہم اکثر دیکھتے رہتے ہیں کہ نیکوکار اشخاص مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر خدا واقعی عادل ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خود انسانوں کے اندر نیکیاں اِس بات کی دلیل ہیں کہ یہ اللہ کی رحمت ہے، لیکن یہ برائیاں کہاں سے آجاتی ہیں، کیا یہ خدا کی عداوت ہے، یا دوسرے لفظوں میں خدا کی غفلت ہے؟

ذہنِ انسانی کی اِس جواب سے تشفی نہیں ہوتی کہ اس میں قدرت کا ایک رازِ پنہاں ہے، جو ہمارے علم سے باہر ہے اِس لئے عقیدت کے ماتحت اسے قبول کر لینا چاہیئے ——— بہت سے لوگوں کی اسے بھی تشفی نہیں ہوتی کہ دنیا کی ہر مصیبت آسمانی راحت کے اضافہ کا باعث ہے، اِس مصیبت سے کئی گونہ زیادہ مسرت اسکے بدلے میں ملے گی ——— اِس سوال کو خدا کے خالقِ خیر و شر دونوں ہونے سے انکار کر کے بھی ٹالا نہیں جا سکتا، بالکلیہ اختیار و تمام تر تخلیق کو اُسی سے منسوب کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی دوسرا تلاش کرنے پر نہیں مل سکتا جو اس کے مقابلہ میں

رکھا جائے اور شریک قرار دیا جا سکے، اور کہا جا سکے کہ خیر کا خالق تو اللہ ہے اور شر کا خالق شیطان۔

آج عقل و دانش کے اس زمانہ میں بھی حیرت انگیز ثنویت کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ونگٹن انگرام بشپ لندن نے ۱۹۱۶ء میں پچھلی جنگ عظیم سے متعلق ایک پیام ربانی سناتے ہوئے فرمایا تھا۔

" تمہیں خدا کو الزام دینے کا کوئی حق نہیں، یہ سب کچھ شیطان کے کرتوت ہیں خدا ہر وقت شیطان اور اس کے کرتوت سے ضیق میں رہتا ہے، اس لئے تم ہمارے خدا کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اس کا بنا ہوا نقشہ ناکام رہا "

یہ صریح ثنویت اور شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن عقل کے نزدیک شرک و ثنویت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا قادر مطلق ہے اور وہی خیر و شر دونوں کا خالق ہے۔

وہمی طاقتوں کا مقابلہ کرنے والے بہادر، عبرانی پیغمبروں نے اس سوال کا معقولیت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں کیا تھا۔

" عموس نے سوال کیا کیا کسی شہر پر ایسی آفت بھی آتی ہے، جسے خدا نے نہ بھیجا ہو "

" حضرت یسع نے جواب دیا "

" میں نور کو بناتا، اور ظلمت کو پیدا کرتا ہوں۔ میں ہی قادر مطلق ہوں جو یہ سب کام کرتا ہے "

" میں نے ہی آہنگر کو پیدا کیا جو کوئلہ سے آگ جلاتا اور اپنے کام کے لئے اوزار بناتا ہے اور میں ہی نے اس کو بھی پیدا کیا جو اس کو تباہ کر دیتا ہے "

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں شر کا وجود ہی نہیں، یہ کہہ دینے سے رہائی نہیں ملتی، اس عریض و طویل دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک

چلے جاؤ، ہر جگہ تم کو دکھائی دے گا کہ شر موجود ہے اور لوگ مصائب جھیل رہے ہیں کہیں زلزلہ نے شہر کے شہر کو بے قصور باشندوں سمیت تباہ کر دیا ہے، اور کہیں طوفان باراں نے، کہیں سیلاب آگیا ہے، اور کہیں قحط نے تباہی پھیلا دی ہے ایک جگہ تم دیکھو گے کہ کوئی مرد حادثۂ اتفاقی کا شکار ہو کر دم توڑ رہا ہے تو دوسری جگہ کوئی عورت دردناک مرض میں مبتلا ہو کر جان دے رہی ہے، کسی جگہ جوان لاعلاج مرض میں گرفتار نظر آئے گا، اور کسی جگہ بچہ پیدائشی طور پر توریثی نقص کا شکار دکھائی دے گا۔ ان کے علاوہ ہر جگہ تم کو انسانیت سے گری ہوئی حرکات کے مجرمین بھی دکھائی دیں گے، یہ وہ ہیں جن کے سروں پر جنگ کی چکی، جرائم کی تلواریں، گناہوں کے آرے، اور معاشرتی ناانصافیوں کے خنجر چلتے ہیں —— جو کوئی جب یہ کہتا ہے کہ "شر کا وجود نہیں" تو یوں سمجھو کہ وہ ایک خلاف حقیقت مبالغہ سے کام لیتا ہے، یا شاید اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ شر کے مقابلہ کے لئے اپنے کو اس قدر شدت کے ساتھ تیار کرو کہ تم میں شر کے وجود ہی سے بے پروائی کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ یہ تو کسی طرح صحیح نہیں کہ "دنیا میں شر کا وجود نہیں ہے"۔

بہر حال! ہمیں اس مسئلہ پر کسی اور طرح سے غور کرنا پڑے گا۔ شر کے وجود سے انکار کر کے ہمیں چھٹکارا نہیں ملتا اور نہ اس میں ایک راز ہے کہ ہم موجودہ اذہان کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

پہلے ان تین مقدمات کو ذہن نشین کر لو:

اول:۔ دنیا میں زندگی ہے، اور اس کرۂ ارضی کے محدود رقبہ میں زندگی کو پھلنا اور پھولنا ہے۔

دوم:۔ زندگی کوئی جامد شے نہیں جو بالکل اپنی مکمل شکل میں ابتدا ہی سے بنا کر بھیجدی گئی ہو، بلکہ زندگی میں سلسلۂ ارتقا جاری ہے۔

سوم :۔ ذی رُوح کو اِس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی اِس حد کے اندر جو اُس کے ماحول اور اُس کی فطرت نے مہیّا کیا ہے، عقل و اِدراک رکھتا ہے کسی قدر تمیز کی قوت بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنی عافیت کا ذمہ دار بھی ہے۔

جب تم یہ تسلیم کر چکے کہ مذکورۂ بالا مقدمات میں جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اُسکے مطابق ایک دُنیا موجود ہے تو چند لوازم سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔

تمیز کی قوت کے ساتھ ہی غلطی کا اِمکان بھی ضروری ہے، اگر یہ اِمکان نہ ہو تو تمیز کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ اور غلطی کے ساتھ اُس کا خمیازہ بھی ضرور ہوگا، کیونکہ یہ غلطی کا لازمی نتیجہ ہے ——— اِس کے بعد غور کرو کہ اگر انسان اپنی عافیت کا براہ راست ذمہ دار ہے تو اُسے عافیت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے والے اعمال اور عافیت کو ختم کر دینے اور نقصان پہنچانے والے اعمال کے مابین تمیز کرنا چاہئیے اَب اگر کسی وجہ سے انسان اِس تمیز میں غلطی کرتا، اور غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے تو لازمی نتیجہ کے طور پر اُس کی عافیت میں خلل پڑ جاتا ہے، چاہے یہ غلط فیصلہ فردِ واحد کا ہو، ایک طبقہ کا ہو یا پوری قوم کا۔ جب اِس طرح لوگوں کی عافیت میں خلل پڑ جاتا ہے تو شکایت کرتے ہیں کہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہے، حالانکہ آزادیٔ عمل سے لطف اندوز ہونا مصیبت کے اِمکان کو مقتضی ہے۔

مذکورۂ بالا مقدمات کی روشنی میں موت پر غور کرو، اگر یہ ضروری کہ پیدائش ہو تو موت بھی ضروری ہے، اگر دُنیا سے رخصت ہونے کا سلسلہ بند ہو جائے تو دُنیا میں آنے کا سلسلہ لازماً بند ہو جائے گا، تھوڑے ہی دنوں میں زمین کا محدود رقبہ بھر جائے گا۔ اور آنے والے کے لئے جگہ باقی نہ رہے گی۔ ہم فرضی طور پر ایک ایسے عالم کا تصور تو کر سکتے ہیں جس میں ولادت و وفات دونوں نہ ہوں، لیکن ایسے عالم کا تصور ممکن بھی نہیں جس میں ان دونوں میں ایک ہو اور دوسری نہ ہو۔

ذرا اس تصور ہی عالم پر غور کرو جس میں ولادت وفات دونوں نہ ہو، کیا وہ عالم جمادات کی دنیا سے زیادہ کچھ ہوگا جس میں نہ جگہ خالی ہوتی ہوگی، اور نہ جا پُری؟ حق یہ ہے کہ وہ ارتقائی نقشہ جو در اصل اس پورے عضویاتی نظام کی رُوح ہے اس بات کا متقضی ہے کہ افراد مرتے رہیں اور دوسرے اُن کی جگہ لیتے رہیں، نسلیں ختم ہوتی رہیں اور جدید نسلیں اُن کی جانشین ہوتی رہیں۔ موت اِس پورے نظام کا سب سے اہم جزء ہے۔

قبل از وقت موت، شدت کے ماتحت موت یا دردناک موت میں یقیناً شر نظر آتا ہے، لیکن صرف انفرادی نقطۂ نظر سے ہم اُسے شر قرار دے سکتے ہیں ورنہ معاشرتی و اجتماعی نقطہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً مصیبت یا شر کا پہلو جو اُس میں نکلتا ہے وہ صرف بے وقت ہونے یا دردناک ہونے میں نکلتا ہے، ورنہ خود موت معاشرتی حیثیت سے شر نہیں بلکہ خیر ہے۔ ہمارا جذبۂ خود غرضی ہمیں مجبور کرتا ہے کہ موت کو بُری چیز قرار دیں۔ ورنہ معاشرت کا نظام تو چاہتا ہے کہ ہم اُسے اپنے وقت پر بغیر کسی ناپسندیدگی کے قبول کریں۔

کہا جاتا ہے کہ بادشاہ عجم زرکسیں نے یونان پر حملہ کے لئے ایک عظیم الشان فوج جمع کی، اس کے بعد ایک پہاڑی پر چڑھ کر پوری فوج پر نظر ڈالی، دیکھا کہ بحری حصہ اُس کے جہازوں سے اور ساحل کا خشک حصہ اُس کے سواروں سے پٹا پڑا ہے، اس منظر کو دیکھ کر زرکسیں پہلے تو مسرور ہوا، لیکن فوراً بعد ہی رونے لگا، اور اُس کی وجہ یہ بتائی کہ جب میں نے اپنی فوج کی یہ کثرت دیکھی تو مسرور ہوا اور جب یہ سوچا کہ ایک صدی کے بعد اُن میں سے کوئی باقی نہ رہے گا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

ذرا سوچو تو یہ خیال رونے کا سبب ہو سکتا ہے؟ البتہ یہ خیال رونے کا

حقیقی سبب بن سکتا ہے کہ بادشاہ اور اُس کی فوج آئندہ ایک صدی، یا ایک ہزار سال تک ایسے ہی رہیں گے، اور نئی پود جس نے اُن کی جگہ لی نہیں پیدا ہوگی۔ آنے جانیوالی چیزوں سے افسوس تو ہو سکتا ہے لیکن یاس کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اگر زرکیس کے عہد کو دوام بخش دیا جاتا تو ہم کہاں پیدا ہو سکتے تھے، اور زرکیس ہی کے عہد کو کیوں دوام ملتا، ابتدائی نمودِ حیات یعنی امیبہ کو دَوام مل جاتا تو یہ سارے جانور یہ انسانوں سے بھری ہوئی دُنیا کیسے وجود میں آتی؟

اگر آج کوئی پیام خالقِ کائنات کی طرف سے آئے کہ موجودہ نسل انسانی کو دَوام دیا جا سکتا ہے، اور آئندہ نئے تصورات، نئی اُمیدوں، اور نئے خیالات کے ساتھ کوئی نسل پیدا نہ ہوگی تو جذبات خود غرضی سے اَلگ ہو کر بتاؤ اُس پیام کا جواب کیا ہوگا؟

طبعی مصائب میں سے دَرد و تکلیف کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن اگر انسان کبھی نہ مَرتا اور نہ کبھی اُس کے بدن کو کوئی دُکھ پہنچتا، بلکہ روئیں تن ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انسان کیوں اپنے گرد و پیش کی مادی دُنیا سے واسطہ رکھتا، اپنے فائدہ، اپنی غذا، اپنی حفاظت اور اپنی شفاء وصحت کے لئے اِتنی دردسری کیوں اُٹھاتا۔ دُنیا ساری کی ساری، بے کار، بے ضرورت، اور ناکارہ اشیاء کا مجموعہ نہ رَہ جاتی؟ اور انسانی فکر و بصیرت کے لئے کوئی جولان گاہ باقی نہ رہتی، اگر دُنیا کی تمام اشیاء کو بکار آمد رکھنا تھا، اگر دُنیا میں انسانی فکر و بصیرت کو متعطل رکھنا منظور نہ تھا، اور جمود سے بچانا تھا، تو دَرد و تکلیف کا وجود بھی ازبس ضروری تھا۔

احساس درد سے صرف اتنا ہی نہیں ہوتا ہے کہ انسان اُس کی بدولت عالمِ مادّہ کو مسخر کرنے اور اپنی حفاظت کی گوناگوں تدابیر میں لگ جاتا ہے، بلکہ اُس سے اعصاب میں جو سنسنی پیدا ہوتی ہے اور دماغ پر جو اُس کا ردِ عمل ہوتا ہے

وہ آئندہ کی شدید تر تکلیف سے متنبہ کر دیتا ہے۔ اِس طرح یہ احساس ایک عقوبت نہیں بلکہ ایک نعمت بن جاتا ہے۔

ذرا تھوڑی دیر کے لئے اِنسانوں کی حالت کو چھوڑ کر جانوروں کی حالت پر غور کرو، یہ تو سب جانتے ہیں کہ نہایت بے دردی کے ساتھ ایک جانور دوسرے کو کھا جاتا ہے، یہ بات بہت بڑے پیانہ پر ہوتی ہے اور جانوروں کے لئے عام بات ہے یہی طریقہ ہے جس سے شر کا پلہ عام نظام اشیاء میں بھاری ہو جاتا ہے لیکن ذرا اور دِقت نظر کے ساتھ غور کرو۔

ہم کو اِنسانی معیار کے ایسی جگہ اِستعمال کرنے سے پوری طرح احتیاط کرنی چاہیئے جہاں یہ ٹھیک نہ بیٹھتا ہو ہم کو دوسرے جانوروں کے سکون و ہیجان کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو مختلف اَنواع کے اَفراد میں باہمی ہمدردی اور ترس کا جذبہ عادتاً مفقود ہوتا ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ احساس درد، جذبات تیقظ، ہیبت، و بے چینی جانوروں میں اِس طریقہ سے بالکل مختلف طریقہ پر ہے جو ہم اِنسانوں میں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً رینگنے والے جانوروں میں یہ اِختلاف بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے اگرچہ ہمارے تصور کے بموجب اُن میں اِنتہائی بے دردی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، پروفیسر وہیلر کے اِس بیان پر غور کرو۔ پروفیسر موصوف اِجتماع پسند کیڑوں کی حد تک ایک سند مستند کا درجہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

"اِس اثناء میں کہ کوئی چیونٹی شیرہ یا شربت سے اپنی غذا حاصل کرتی ہو اُس کے معدہ کو قینچی سے کتر دیا جا سکتا ہے، اور اُس کے کھانے میں اُس سے کوئی خلل نہیں پڑے گا"

اِنسانوں کی حالت سے کتنی مختلف حالت ہے؟ گویا یہ اُس دنیا کی بات ہی نہیں ہے۔

اِس جگہ دو ایسے مفکرین کے نتائج تحقیق و دلچسپی کا باعث ہوں گے جنھوں نے اپنی زندگیاں جانوروں کی حیات پر غور کرنے کے لئے وقف کردی ہیں یہ دونوں حضرات اپنی علمی تحقیقات کے علاوہ انسانی ہمدردی کے لئے بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں ——— الفریڈ رسل ویلیس لکھتے ہیں۔

”آج کل جب کہ تنازع فطرت سے نسبتہً زیادہ واقفیت حاصل ہے ہمارے اکثر ارباب قلم اسے بیرحمی و بیدردی کی ایک طویل داستان بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ داستان انسانی طبیعت کے خلاف بغاوت سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس یقین کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ یہ ساری داستان واقعہ نہیں بلکہ بڑی حد تک محض مبالغہ ہے، جانوروں کی مفروضہ بپتا اور ایذا رسانی کا کہیں حقیقتہً وجود نہیں ہے، بلکہ اچھے بھلے مردوں اور عورتوں کا ان ہی حالات میں کیا حال ہوتا۔ اس تصور کا عکس ہے جو جانوروں کی داستان مصیبت بن گیا ہے۔ ورنہ خود جانوروں کے اندر بھی جو تنازع للبقاء جاری ہے، اور اس سے وہ جس قدر متاثر ہوتے ہیں، وہ اُن کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ . . . . . . بہر حال ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تنازع للبقاء سے متعلق یہ معروف تصور کہ اُس سے جانوروں کو دکھ ہوتا ہے یا عقوبت جھیلنا پڑتی ہے عمداً وحقیقتاً حقیقت کے بالکل برخلاف ہے۔ جو بات حقیقتاً معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حد زیادہ سے زیادہ زندگی، اور کم سے کم دکھ اور درد کے ساتھ زندگی سے استفادہ“ یہ ہے آرزو ——— ایک کی موت اور دوسرے کی ولادت“ اس لائحہ عمل کی ضرورت تو ماننا ہی پڑے گی، بغیر اُس کے عضویاتی

دُنیا کی ساری ترقی بند ہو جائے گی۔ ایسے لائحہ عمل کا تو تصور بھی مشکل ہے جس سے مسرتوں کی مزید مقدار محفوظ کرلی جا سکے۔"

چارلس ڈارون صاحب نے بھی یہی خیال پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"جب ہم اِس تنازع للبقاء پر غور کرتے ہیں تو ہمارے قلوب کو اِس یقین سے تسکین ہو جاتی ہے کہ حقیقتاً یہ جنگ فطرت جو جانوروں میں ہوتی ہے وہ مسلسل جاری نہیں رہتی، اور اُس سے کوئی خوف و دہشت بھی اُن میں نہیں پائی جاتی، عام طور سے موت پر آمادگی موجود ہے، اور بعد کو زیادہ تعداد میں زیادہ مسرور، زیادہ تندرست اور زیادہ قوی جانشین پیدا ہو جاتے ہیں۔"

اِس بیان کے بعد بھی ایسی بہت سی مصیبتیں باقی رہ جاتی ہیں جن سے بنی نوعِ انسان کو واسطہ پڑتا رہتا ہے مثلاً غیر معمولی اموات، حد سے بڑھی ہوئی تکالیف، بے قصور اشخاص پر طبعی و اخلاقی مظالم کے بے شمار واقعات۔

اِن مصائب کے بارے میں تین خیالات ہیں جن پر غور کرنا چاہیئے۔

اول یہ کہ اگر اِنسان کو چند مضرتیں پہنچتی ہیں، تو بہرحال یہ مضرتیں اِسی دنیا سے متعلق ہیں جس میں جمود نہیں روانی پائی جاتی ہے آج کچھ مضرتیں ہیں تو کل کچھ فائدے بھی ہوں گے۔ دنیا تو ایک عمل مسلسل کی حیثیت رکھتی ہے، مضرت کو صرف اِس طرح نہ دیکھو جس طرح وہ حال میں ہیں، بلکہ یہ بھی دیکھو کہ مستقبل میں یہ کیا ہونے والی ہیں۔ واقعات و حوادث کا دھارا اسے ماضی سے مستقبل کی طرف لے جا رہا ہے، یہ مضرت عنقریب یا ختم ہو جائے گی یا منافع کی شکل اختیار کرلے گی۔

حیوانات چند نسلوں کے اِرتقائی دَور سے عبور کرنے کے بعد غیر شعوری طور پر

ماحول کے موافق بن جاتے ہیں۔ ایک مہذب انسان اپنے شعور کے ذریعہ خود ماحول کو کسی حد تک اپنے مطابق بنا لیتا ہے۔ ایسا کر کے وہ مضرت و مصیبت کو بے اثر کر دیتا ہے۔

مثلاً قدیم مصریوں کے لیئے دریائے نیل کی طغیانی سب سے بڑی مصیبت کا باعث تھی، اگر دریائے نیل میں پانی پوری طرح نہیں آیا تو سارا ملک بے آب و گیاہ ہوگیا۔ زمینیں بنجر پڑی رہیں، پورا مصر تباہی میں مبتلا ہوگیا، پہلے سال تنگی ترشی رہی اور دوسرے سال قحط اور فاقوں سے موت کا بازار گرم ہوگیا —— اسی طرح اگر دریا میں پانی زیادہ آگیا تو سارا ملک سیلاب کی نذر ہوگیا، کھیتیاں بہ گئیں، مکانات مسمار ہوگئے۔ سارا علاقہ تہ آب ہوگیا، مال گیا، جانیں گئیں اور جو بچ رہے اُن کے پیٹ بھرنے کا سہارا باقی نہ رہا —— مصریوں کو انسانی اقتدار سے باہر کوئی چیز اس دریا سے زیادہ ناقابلِ دسترس دکھائی نہ دیتی تھی۔ تقدیر کی نادیدہ طاقت کا مظاہرہ جیسا یہاں ہوتا تھا شاید کسی دوسری جگہ نہ ہوتا ہوگا۔ اِس مصیبت کو دفع کرنے کے لیئے دعائیں، قربانیاں، اعمال حسنہ وغیرہ سے اِستعانت کا موقع تھا، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اِس مصیبت کو انسانیت کے حق میں خدا کی بے اِنصافی، سمجھکر اپنی بے بسی کے اِقرار کے ساتھ برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن نہیں، آج یہی عظیم الشان ناقابلِ اِرتفاع مصیبت بنی نوعِ انسان کے مصائب کی فہرست سے خارج کر دی گئی —— قدیم مصری دریائے نیل کے دیوتا کو راضی کرنے کے لیئے مندر بناتے تھے لیکن جدید مصریوں نے دریا کی رَوانی کو قابو میں لانے کے لیئے بند بنا ڈالے، —— حکومت مصریہ نے بڑے بڑے خزانۂ آب بنوائے، سیکڑوں میل لمبی نہریں تیار کرائیں، ہزاروں آب رَو دروازے تعمیر کرائے۔ ماہرین کا ایک وسیع عملہ آب پاشی کی نگرانی کرتا ہے۔

اب مصری کسان کھیتی باڑی کرتا ہے اور یہ اطمینان رکھتا ہے کہ پانی حد سے زیادہ یا ضرورت سے کم نہیں آئے گا۔

وبائیں مثلاً کالا بخار، طاعون، ہیضہ وغیرہ سارے براعظم یورپ پر جھاڑو پھیر دیتے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں یہ وبائیں پھیلتی رہتی تھیں۔ جہاں وبا پہنچی، آفت آئی، دماغ بے کار اور ہاتھ پیر شل ہو گئے، ایک مصیبت ہے کہ ناقابل علاج ہے۔ آدمی کے بس کی بات نہیں، خدا کا کام خدا ہی جانے، ——— لیکن آج یہ باتیں افسانۂ ماضی ہو گئیں۔ اب کالی بلا کا پتہ نہیں، طاعون کا وبائی مرض اور ہیضہ کا حملہ شاذونادر ہوتا ہے اور شروع ہوتے ہی ختم کر دیا جاتا ہے ——— امراض کو روکنے والی اور علاج کرنیوالی دوائیں کامیاب ہیں ——— اور انسان ہر نسل میں ——— مصائب کی فہرست سے مرض پر مرض خارج کرتا جا رہا ہے۔

کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک قنوطی اپنے بیان کو ختم بھی نہیں کر چکتا ہے کہ وہ تکالیف جن پر اس کے دعویٰ کی بنیاد قائم تھی ختم ہو جاتی ہے۔ شوپنہار نے قصد کیا کہ عالم پر مصائب کے محیط ہونے کا ثبوت دے، اس نے مثال میں پیش کیا کہ:۔

> "لوگ اس قدر مصائب، محتاجی، اور موت کو برداشت کر رہے کہ حد و حساب سے باہر ہے، امریکہ کے لاکھوں زنگی غلام اور یورپ کے ۴۰ لاکھ باشندگان فاقہ کشی اور محتاجی میں بسر کر رہے ہیں، ان کی بدنصیب زندگیاں نمناک کمروں اور بشاشت سے خالی کارخانوں میں بسر ہو رہی ہیں"

شوپنہار نے جب یہ لکھا تھا اس سے بیس ہی سال کے اندر امریکہ نے غلامی کا سلسلہ

ختم کر دیا، اور پچاس سال کے اندر ہی یورپ کے باشندوں کی حالت بڑی حد تک سُدھر گئی، اگرچہ قابلِ اطمینان درجہ تک تو ابھی ترقی نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باشندگان کی حالت اب ویسی نہیں ہے جیسی شوپنہار نے پیش کی تھی۔

سمندر میں طوفان نے اگر انسانوں کو ڈبویا تو انسان نے اس کی وجہ سے ایسے بڑے بڑے جہاز بنانا اور اتنے قوی انجنوں سے اُن کو چلانا سیکھ لیا کہ آج وہ طوفانوں سے گذر سکتا ہے۔ اُس نے قطب نما بنا ڈالا، اُس نے زاویہ پیما تیار کر لیئے۔ فن جہاز رانی کو ترقی دی، ساحل بنائے، روشنی گھر تعمیر کر لئے ــــ اگر مکانات بجلی سے خراب ہو گئے اور زلزلوں سے منہدم ہو گئے تو آدمی نے بجلی کو دوسری طرف منحرف کر دینے کا فن سیکھ لیا، ایسے مکانات بنا کر تیار رکھے جو زلزلہ میں منہدم نہیں ہو سکتے ــــ اگر بنجر علاقہ میں فاقہ کشی برداشت کرنی پڑی تو لاکھوں کی تعداد میں دوسرے زرخیز علاقوں میں جا کر بس گئے۔ اگر بڑے شہروں میں گنجان ہونے کی وجہ سے دقتیں ہوئیں اور بیماریاں پیدا ہونے لگیں تو آب وہوا کو صاف کرنے کے نئے نئے طریقے معلوم کر لئے گئے۔ درد کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے مسکن اَدویہ تلاش کی گئیں ــــ معاشرت کی بُرائیاں جو غلط طریقۂ حکومت سے پیدا ہوتی تھیں اُصولی جمہوریت کی ترقی سے کم کی گئیں ــــ کاش کوئی سلبی اعداد شمار کا طریقہ اختیار کر کے ان برائیوں کے اعداد پیش کر دیتا جو اب نہیں پائی جاتی ہیں۔

بعض ایسی مصیبتیں واقعتہً ہمارے اس کرہ کی طبعی حالات کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہیں جن سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ ۳۰ جون ۱۹۰۸ء کو سائبیریا کے ضلع اینسی میں ایک بہت بڑا شہاب ثاقب گرا جس سے متعدد آتش فشان

دہانوں سے آگ بھڑک اٹھی اور ایک ہزار میل کا نوخیز جنگل خاک سیاہ ہو کر رہ گیا، اِس سے پہلے کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا شہاب ثاقب اس علاقہ میں گرا تھا جو آج کل صحرائے اریزونا کہلاتا ہے، اس سے تقریباً ایک میل عریض سوراخ پیدا ہو گیا تھا اِس قسم کے حوادث سے نہایت خوفناک مصائب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مقابل اتفاقات میں بھی بڑی وسعت ہے لیکن بلا شبہ ایسی صورتوں کو ہم "بس سے باہر" شمار کرنے پر مجبور رہیں۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ لوگ بجلی گرنے اور طوفان آنے سے مرتے رہتے ہیں۔ جو شہر لو ہے، کنکریٹ یا بانس اور کاغذ وغیرہ سے تعمیر نہیں ہوتے وہ زلزلہ سے مسمار ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں کی جانیں جاتی ہیں۔ غرض کہ ایسی مصیبتیں ہیں جن سے بچنا ناممکن ہے لیکن یہ بہت کم ہیں۔

دنیا کی تمام چیزوں میں حرکت ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کل کی مصیبتیں آج ختم ہو چکی ہیں اور بجا طور پر امید رکھتے ہیں کہ آج کی مصیبتیں کل ختم ہو جائینگی ممکن ہے ان مصیبتوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی ہم کل تک معلوم کریں۔

دوسرا نکتہ جسے یاد رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک فرد اپنے آپ کو حالات زندگی کے مقابلہ میں تنہا پا سکے۔ اور یہ محسوس کرے کہ ایک شخص اور مواقع حیات کے مابین غیر مساویانہ جنگ جاری ہے۔ بلکہ اسکے اور مواقع حیات کے مابین ایک چیز اجتماع بھی ہے۔

ہم میں سے ہر شخص۔ مختلف قسم کے اجتماعی نظام کا جزو ہے، خانوادہ ہے شہر ہے، حکومت ہے، مفادات پر مشتمل جمعیتیں ہیں، پارٹیاں ہیں، مذاہب ہیں اقوام ہیں —— ہمیں اجتماعی نظاموں کی رکنیت سے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ ہر شخص گذشتہ و موجودہ افراد اور نسلوں کے کارناموں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور اسی طرح ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ جو آفتیں ہم پر آجاتی ہیں اگر اُن میں سے کسی ایک کی مکمل تحقیقات کی جائے اور اسباب وعلل کی زنجیر کے ایک دوسرے سے پیوستہ حلقوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ آفت صرف حادثۂ طبعی نہیں بلکہ بالواسطہ یا بلا واسطہ نتیجہ ہے اس غلطی کا جو زمانہ ماضی میں فرد، افراد یا جماعتوں سے سرزد ہوئی تھی، یہ غلطی ہو سکتی ہے کہ خود ہمارا عمل ہو یا ہماری طرح دوسرے انسانوں کا عمل، یہ غلطی کسی کام کے کرنے نہ کرنے یا وقت سے بے وقت کرنے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

یہ مصائب درحقیقت کسی اندھی تقدیر کا تیر نہیں ہوتے، جو نہ کچھ سمجھتی ہو اور نہ سنتی ہو، انسانی سعی وعمل جس کے مقابلہ میں بے کار اور دنیا دی اُمید و اَمل جس کے حضور میں بے نتیجہ ثابت ہوں، بلکہ مصائب انسان کے اعمال یا بے عملی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، خواہ یہ نتیجہ بالواسطہ ہوں، یا بلا واسطہ۔

انسان چونکہ اجتماع پسند ذی روح ہے اس لئے عادتاً یہ اُصول اتحاد باہمی کا بھی پابند ہوتا ہے۔ جب کبھی ایک جماعت یا گروہ درست عمل کرتا ہے تو جماعت انسانی کے تمام افراد اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، اسی طرح جب کبھی کوئی جماعت یا گروہ نادرست عمل کرتا ہے تو اس کا خمیازہ بھگتنے میں بھی سب حصہ دار ہو سکتے ہیں مثلاً ایک ملک ہے کہ وہاں وبائی امراض کے خلاف کامیاب جد وجہد اور احتیاط برتی جاتی ہے، اس ملک کے تمام افراد صحت وسلامتی سے بہرہ ور ہوں گے، دوسرا ملک ہے کہ وہاں اس قسم کی کوئی جد وجہد نہیں کی گئی، ظاہر ہے کہ اس دوسرے ملک کے ہر فرد کے لئے وبا میں مبتلا ہو جانے کا امکان موجود ہے —

اس قسم کے معاملات میں اگر ہم فرد کو دیکھتے ہیں تو بے انصافی اور مصیبت معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر ہم جماعت کو دیکھتے ہیں تو یہ مصیبت بالکل منصفانہ نظر آتی ہے۔ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک اسکیم کے ماتحت ہو رہا ہے اور اس اسکیم کی

بنیاد قائم ہے "وحدتِ انسانیت" پر اس لئے متحدہ اعمال اور صحیح راہِ عمل اجتماع کے ہر رکن کے لئے فرد اور خانوادہ سے لیکر مجموعہ اقوام تک سب کیلئے ضروری ہے۔ اگر اس میں خرابی آئی تو پھر عافیت معلوم! ــــ وہ مصیبت جو فرد پر آتی ہے، ممکن ہے کہ اُس کے ذاتی فعل یا کسی متحدہ عمل کی ناکامی یا غلطی کا نتیجہ ہو ــــ مصیبت اور تکلیف ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کو اُس کی انفرادی یا اجتماعی غلطی پر تنبہ کیا جاتا ہے۔

اِس جگہ بھی عالمِ کائنات کے اس اُصول کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ دُنیا متجدد و متبدل ہے، کوئی جامد، وغیر متبدل شے نہیں ہے۔ اجتماع میں اگر خرابی ہے تو اُسے بھی طبعی ماحول کی طرح دُرست کیا جا سکتا ہے، بلکہ اجتماع کو طبعی ماحول کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ دُرست کیا جا سکتا ہے۔ جہالت، نقائص جرائم امراض، جنگیں یہ سب شائستگی کی ترقی کے ساتھ ختم یا کم ہو سکتی ہیں، اور جب یہ چیزیں کم ہو جائیں گی یا باقی نہ رہیں گی تو اُسکی وجہ سے نیکوکار اشخاص جو مصیبتیں جھیلتے ہیں وہ بھی کم ہو جائیں گی؛

تیسرا خیال جو اس سلسلہ میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تناسب و توازن کا اُصول ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، ہم کو بالارادہ مساعی کے ذریعہ اطمینان کے ساتھ توازن کے اُصول کی پابندی کرنی چاہیئے، ہمیں اپنے جذبات وخیالات کی رَو میں آکر کسی ایک پلہ کو جھکا دینے کی کوشش سے حذر کرنا ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مصائب زندگی ابھی تناسب سے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جس تناسب سے ہماری توجہ ان کی طرف بڑھتی رہتی ہے، اخبارات کے صفحات جرائم، بلوے، جنگ اور دوسری قسم کی تباہی کی داستانوں سے سیاہ نظر آتے ہیں، اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ ساری دنیا شر و فساد اور تباہی و خرابی کے

واقعات وحوادث سے بھری پڑی ہے۔ یہ خیال کیوں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل مواصلات ورسل ورسائل کی آسانیوں نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ کرۂ ارضی پر واقع ہونے والے ہر حادثہ کی خبر جلد از جلد ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچا دی جائے۔ اخبارات کے نمائندے اور خبر رساں ایجنسیاں ہمارے اجتماع کے حساس عروق واعصاب ہیں جو اپنا کام تیزی کے ساتھ اس لئے انجام دیتے رہتے ہیں کہ ہم اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہوتے رہیں۔ اور اس کے علاج کی فکر کریں، اس کی وجہ سے یہ تصور صحیح نہیں کہ سارا کرۂ ارضی حوادث ومصائب سے پُر ہے، یا کم از کم حوادث و مصائب بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہیں ——— ظاہر ہے کہ ان حوادث کے علاوہ جن کی خبریں ہمیں اخبارات کے ذریعہ ملتی ہیں، کروڑوں انسان عافیت وسکون کے ساتھ بھی تو ہوں گے۔ اُن کے متعلق کوئی اخبار خبر نہیں دیتا۔

کارخانے، جیل خانے، پاگل خانے، اور لاعلاج مریضوں کے دواخانے ہیں اور یقیناً ہیں۔ ان کا شمار تو کیا جاتا ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ سارا شہر یہی نہیں ہے ان سے بہت زیادہ تعداد میں خوشگوار زندگی بسر کرنے والوں کے مکانات بھی تو ہیں ——— یہی حال ہے تاریخ کا، ہم جب تاریخ کے اوراق اُلٹتے ہیں تو دل ہلا دینے والے واقعات وحوادث کا ایک طویل و وسیع جنگل دکھائی دیتا ہے جس میں حوادث کی ویران پہاڑیاں اور چٹانیں نظر آتی ہیں ——— جنگ، مذہبی وسیاسی فسادات، سازشیں، ستم رانیاں، طاعون، اور زلزلے ——— ان حالات و حوادث کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کا زمانہ اور ملک کا ملک ان ہی جنگلوں اور پہاڑوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں ان پہاڑوں اور جنگلوں کے بیچ میں بہت سے سرسبز میدان، اور بہت سی

آبادیاں ہیں جہاں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے چین وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جدید دماغ صداقت کو اوّلین درجہ پر رکھتا ہے —— پچھلی جنگ عظیم کا ہولناک تجربہ سامنے ہے، فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ دنیا میں حیرانی، پریشانی اور بے چینی کا دور دورہ ہے، اجتماعی زندگی خطرے میں ہے اور تباہ ہو رہی ہے، افراد کا کیا کہنا! موت کی گرم بازاری ہے، کھیتیاں برباد ہو رہی ہیں، شہر ویران ہو رہے ہیں —— دُنیا کی آبادی کا کتنا بڑا حصہ ہے جو جان و مال کی بربادی سے دوچار ہو رہا ہے —— اس صورت حال سے دماغ میں سکون کی بجائے ہیجان بپا ہو گیا، اُنیسویں صدی کی رجائیت کہ

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اِس کو خلاف واقعہ معلوم ہونے لگی —— یہی نہیں بلکہ جدید دماغ نے فیصلہ کیا کہ اُنیسویں صدی کی علمی ترقیوں سے یہ اُمید کہ دُنیا کے لئے مفید ہوں گی، غلط ثابت ہوئی —— اِس ترقی سے تہذیب اِنسانی آگے بڑھ سکے، یہ صحیح نہیں ہے، جدید دماغ کے سامنے یہ سوال آیا کہ فن حیاتیات میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے بعض انواع حیوانات نیست و نابود ہو گئے اور خود انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ تہذیبیں پیدا ہوئیں اور مٹ گئیں تو ہم اس خیال پر کیسے یقین کر لیں کہ فطرت کی کوئی ایسی طاقت بھی موجود ہے جو ہمارے مساعی سے بے نیاز ہو کر دنیا کو آگے بڑھا رہی ہے، یا اس پر کس طرح مطمئن ہو جائیں کہ حدوث عالم کا اصول جب سے معلوم ہوا ہے، دنیا میں شر کے وجود کا مسئلہ ناقابل اعتناء ہو گیا ہے۔

اِن خیالات کا اثر یہ پڑا ہے کہ موجودہ دَور کے افکار میں قنوطیت کی ایک
ہر سی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سے لوگ زندگی کو صرف "شاد باید زیستن
شاد باید زیستن" کے اُصول پر نباہ رہے ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ زندگی
بلکہ بے کیف چیز ہے، چونکہ ہم اس کے سوا کچھ کر نہیں سکتے کہ بہرحال اسے
گذار دیں، اِس لئے گزار رہے ہیں ——— حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات
توازن و اِعتدال کے فقدان کا نتیجہ ہیں ———

جب ہم اِس کائنات کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں، دُنیا کی پیدائش
اور تہذیب کی نشوونما پر غور کرتے ہیں، اِنسانی آزادی کی قیمت کا اندازہ لگاتے
ہیں، سائنس کی ترقیوں کو دیکھتے اور غور کرتے ہیں کہ آج اِنسانی ضروریات
کی تکمیل کے لیے چیزوں کی کس قدر اِفراط ہے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ دنیا میں
شر نہیں بلکہ خیر کا پلہ بھاری ہے۔ اگر ہم اپنے کانوں کو فطرت کی آواز کی طرف
متوجہ کریں، تو اُس کے گوناگوں نغموں کو اچھی طرح سُن سکتے ہیں، یہ نغمے
دولتمندی، مسرت اور شادمانی کے نغمے ہیں، نوحہ و مرثیہ نہیں ہے۔ اگر
اِس دنیا میں کہیں کہیں آنسوؤں سے بھرے ہوئے گڑھے ہیں تو
مسرت و شادمانی سے لہلہاتے ہوئے چمن اور مرغزاروں کی بھی کمی
نہیں۔ اور خوشی کی ایسی دلفریب چوٹیاں بھی موجود ہیں جو آفتاب کی
کرنوں میں جگمگا رہی ہیں۔

اِس ساری بحث کا نتیجہ قنوطیت نہیں ہو سکتا، اور اگر رجائیت
سے یہ مطلب ہے کہ شر کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے یا یہ سمجھا جائے
کہ شر اور مصائب کا علاج خود بخود ہو جائے گا تو اس بحث کا نتیجہ
رجائیت بھی نہیں نکلتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قنوطیت و رجائیت

دونوں کے برخلاف نتیجہ "اِصلاحیت" ہونا چاہیئے —— جارج اِلیٹ کی زبان میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ :-

"یہ تو یقینی ہے کہ حال ماضی سے بہتر ہے ' اور مستقبل حال سے بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کوشش کی جو اُس کو بہتر بنائے"

آٹھواں باب

دُرُشت و نادُرُشت

درست و نادرست

عصرِ حاضر میں درست و نادرست کے لیے کوئی ایسا معیار موجود نہیں ہے جسے سب قبول کریں۔ عادتاً لوگ اِس معاملے میں اپنے آبائی مذاہب کی طرف نظر دوڑاتے تھے کہ وہاں سے انہیں کوئی معیار مل جائے گا۔ لیکن اِس زمانے میں ہر مذہب کے پیرو دوسرے مذاہب کے وجود سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ یہ دوسرے مذاہب بعض اوقات اُن کے اپنے مذہب سے بالکل مختلف معیار پیش کرتے ہیں۔ اِس لیے موجودہ زمانے میں اِن معیاروں کا مستند ہونا خود قابلِ بحث ہو گیا ہے ——— اِلہام، وجدان اور ضمیر آج اِن میں سے کسی دعوے کو بغیر تنقید قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہم و قیاس کو تو عقل کی عدالت میں پیش ہونا ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود عقلی استدلال کے لیے بھی کوئی ناقد و مُبصر مل سکتا ہے؟

ہم اُمید کرتے تھے کہ شاید فلسفہ ایک مبصر کا کام انجام دے سکیگا۔ لیکن اِس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ فلسفہ اِس سلسلہ میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتا ——— ایک مدت دراز سے تصوریت فلسفیانہ افکار پر چھائی ہوئی ہے۔ افلاطونیوں نو فلاطونیوں، کانٹیوں اور ہیگلیوں نے بہت سر مارا کہ تصورِ حسنات، خیرِ مطلق

امر قطعی، اور صداقت، حسن اور نیکی کا قدرتہائی دریافت کریں، اِس طرح اُن کے ذریعہ سے اِنسانی زندگی کے لیے رہبر کامل پیدا کر لیا جائے، لیکن دو ہزار سال کی محنت شاقہ اور دماغی کاوش سے کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں کیا جا سکا جو قبولیت عام حاصل کر سکتا ــــ سچ یہ ہے کہ فلسفہ کا کوئی مکتب خیال ایسا موجود نہیں جس کے متعلق ہم یہ کہہ سکیں کہ وہاں بنی نوع اِنسان کے لیے عملی اخلاقیات کی عقلی بنیاد مل سکتی ہے۔

اُٹھارھویں صدی کے مفکرین نے فطری حقوق کا اُصول پیش کیا، اور اِس پر اِصرار کیا کہ دُنیا میں آنے والا ہر اِنسان اپنے ساتھ چند بنیادی حقوق رکھتا ہے۔ طے یہ کیا گیا کہ تمام قوانین و ضابطے اِن بنیادی حقوق کے مطابق ہونے چاہئیں۔ درست و نادرست کا معیار یہی بنیادی حقوق ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ فطری حقوق کا نظریہ اس زمانے کی سیاسیات پر طاری و ساری تھا۔ اُمریکی اِعلان آزادی کے تمہید میں لکھا ہے کہ:۔

"ہم اِس صداقت کو بدیہی مانتے ہیں کہ ہر اِنسان پیدائشی طور پر مساوات رکھتا ہے، خالق مطلق اِنسان کو پیدا کرتے وقت اُسے چند غیر منفک حقوق بھی عطا فرماتا ہے، اُن ہی میں سے زندگی، آزادی، اور تلاشِ مسرت کے حقوق بھی ہیں۔"

تیرہ سال کے بعد فرانس کی قومی مجلس نے اِعلان کیا کہ:۔

"تمام سیاسی جمعیتوں کا آخری مقصد اِنسان کے فطری اور اِمتدادِ زمانہ سے زائل نہ ہونے والے حقوق کی حفاظت ہے، یہ حقوق، آزادی، جائیداد، ضمانت اور مزاحمت ظلم کے اختیارات ہیں"

کسی صداقت کو اُس وقت تک بدیہی نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ ہر سمجھ دار آدمی کیلئے

ناقابلِ انکار نہ ہو، حالانکہ اِن مذکورۂ بالا اصول سے ہمیشہ اِنکار کیا گیا۔ ٹھیک اُسی وقت جب کہ امریکی اعلان آزادی دعویٰ کر رہا تھا کہ آزادی اِنسان کا غیر منفک حق ہے جو کسی طرح اُس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ خود امریکہ میں غلامی ایک آئینی اور قانونی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اِس اعلان سے تقریباً ایک صدی بعد تک غلامی کا یہ قانونی طریقہ باقی رہا ـــــ خود ہمارے دورِ حاضر میں یورپ کے بہت ممالک ہیں، جہاں دعوائے آزادی سے فلسفیوں نے اِنکار کیا اور آمروں نے اُسے ٹھکرا دیا ہے ـــــ

"فطری اور اِمتدادِ زمانہ سے زائل نہ ہونے والا حق جائیداد" کو سترہ کروڑ باشندگانِ رُوس کی طرف سے عملاً ٹھکرایا جا چکا ہے ـــــ صرف اِصرار کافی نہیں اِس سے کام نہیں چلتا کہ کوئی شخص کسی اُصول کو بار بار "بدیہی صداقت" قرار دیتا رہے۔ اگر کوئی شخص بدیہی صداقت سے اِنکار کرے تو پھر کیا ہوگا؟

اُنیسویں صدی کے مفکرین یہ یقین رکھتے تھے کہ اخلاقیات کی مضبوط بنیاد قانونِ ارتقاء سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ فطرت نے بقاءِ اصلح تک پہنچنے کیلئے تنازع للبقاء جاری کر رکھا ہے، اِس طرح فطرت ارتقاءِ نوعی میں مصروف ہے عملاً یہ طریقہ اگرچہ سخت بلکہ ظالمانہ ہے لیکن آخری ارتقاء بہر حال رحمت ہی ہوتی ہے یہ تھا درست و نادرست کا اِمتحان ـــــ جو فطرت کے فیصلہ کی تعمیل کرتا ہے وہ درستِ عمل کر رہا ہے، اور جو اِس فیصلہ کے روکنے کی سعی میں مبتلا رہے وہ نہ صرف ایک نادرست فعل کا مرتکب ہے بلکہ ایک ناممکن عمل میں لگا ہوا ہے۔ جو طریقۂ عمل سمندر، کیچڑ اور اِس کے بعد جنگل کی تیاری میں جاری ہے وہی اِنسانی سماج میں جاری ہونا چاہیئے ـــــ اِس اُصول کا نتیجہ یہ تھا کہ افراد کے مابین بے تکان معاشی مقابلے، مفادات کے مابین بے ضمیر سوداگری، اور حکومتوں کے

مابین بے رحم مناقشات کو مبنی بر انصاف سمجھا جاتا تھا ——— صنعتی دباؤ دنیا کے فطری عمل کا ایک جزو تھا، اور جنگ انسانی ترقی کا مقررہ ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔

فکر عمیق فوراً ہی یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ یہ سب منطقی مغالطے ہیں۔ بسوء اتفاق دیکھئے کہ یہ لفظ "قانون" اپنے مختلف استعمال کی وجہ سے بڑی اُلجھن کا باعث بن گیا ہے۔ "قانون" کا لفظ دو بالکل مختلف مفہوموں کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک تو عام مفہوم ہے، اور دوسرا وہ مفہوم ہے جو سائنس کی اصطلاحات میں اُس سے مراد لیا جاتا ہے، مثلاً "قانون حرکت" "قانون ارتقاء" ——— یہاں لفظ قانون سے وہ مراد نہیں ہے جو اخلاقی حکم کو بیان کرنے میں مراد ہوتی ہے؛ مثلاً "تم کو چوری نہیں کرنی چاہیئے یہ ایک حکم ہے اور ایک قانون ہے"، اسی طرح اُس سے مراد کسی مجلس مقننہ کا بنایا ہوا وہ قاعدہ وضابطہ بھی نہیں ہے جس کو سزا کی قوت سے جاری کیا جاتا ہے۔ کیونکہ فطرت کوئی فرمان نہیں جاری کرتی۔ فطرت حقیقتہً کوئی شخصیت نہیں ہے جو فرمان جاری کرے اور حکم دے۔ فطرت تو صرف عالم بول چال میں استعمال کرنے کے لیے ایک خوبصورت سا لفظ ہے۔ ہم چاہیں تو سمندر، پھر کیچڑ، پھر جنگل کہیں اور چاہیں تو اس سے بہتر اور کوئی طریقہ معلوم کرکے اُس سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس کے لیے واقعتہً کوئی حکم نہیں جو ہمیں اس طریقۂ بیان یا "قانون ارتقاء" کے ماننے پر مجبور کرتا ہو ——— اسی طرح حقیقتہً کوئی تکوینی مقننہ نہیں موجود ہے جو ایک قانون کو نافذ کرے اور دوسرے سے روکے۔

مزید برآن ہکسلے کے بیان کے بموجب "بقاء اصلح" کا مطلب "بقاء احسن" نہیں ہے بلکہ اُس کا مطلب صرف اِس قدر ہے کہ موقع اور حالات کے لیے جو سب سے زیادہ مناسب وموافق ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ اکثر یہ مناسب ترین وموافق ترین آئندہ کے لیے ترقی ووسعت کی بجائے کمتر وناقص تر کے

وجود کا سبب بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظرتِ کی ارتقاء کا وجود انسان کے لیے کوئی معیارِ اخلاق مہیا نہیں کرسکتا، جب سے یہ نظریہ پیش ہوا ہے اُس وقت سے اَب تک سیکڑوں طرح کی سخن سازیوں کے باوجود "قانونِ ارتقاء" سے معیارِ اَخلاق تلاش کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

ان مذکورۂ بالا اُمور کے علاوہ اخلاقی قوانین کے لیے ایک اور بنیاد ہے جو اگرچہ اس زمانہ میں تو نہیں پیش کی جاتی لیکن قدیم زمانہ میں عام طور پر مقبول نہیا سمجھی جاتی تھی۔ یہ بنیاد کسی فرقہ یا جماعت کا رواج ہے۔ برگسان کہتا ہے۔

> "اخلاق اپنی اصلیت کے اعتبار سے تمام تر رواج ہے؛
> اور چونکہ مذہب رواج کو توڑنے سے روکتا ہے، اِس لیے
> اخلاق مذہب کے اشتراک کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا ہے۔"

اِس خیال کو مَنو کے ہندو دھرم شاشتر میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ پیش کیا گیا، اُس میں لکھا ہے کہ:-

> "جو رواج بغیر انقطاعِ زمانۂ نایادگار سے موجود ہو؛
> اِس کو مقدس بزرگوں کا طریق عمل کہا جاتا ہے۔"

لیکن ذرا غور کیجیے کہ اگر اِس رواج کو جو زمانہ نایادگار سے چلا آرہا ہو بطور بنیاد اخلاق قبول کر لیا جائے تو اُس کا نتیجہ کیا نکلے گا ——— کسی خاص سماج کا کسی خاص زمانہ میں جو قانونِ اَخلاق تھا، اُسے آج بھی بلکہ دَوامی طور پر قبول کر لیا جائے ——— یعنی آدم خور ممالک کے لیے آدم خوری عین اَخلاق ہے اور وہاں آدم خوری ہی جاری رہنی چاہیئے ——— اگر اِس اُصول کو مان لیا گیا تو اَخلاقیات کا دفتر ایک غلط طبع شدہ کتاب ہو کر رہ جائے گا۔ جس میں پھر کوئی

ترمیم کی گنجایش باقی نہیں رہے گی، اور یہی نہیں بلکہ کبھی بھی کسی نسل کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ پیش رفتگان کے مقررہ طریقۂ عمل کے علاوہ کوئی اور طریقۂ عمل اختیار کر سکے؛

اگر خدانخواستہ وحشت و بربریت کے زمانہ سے اب تک یہی معیارِ اخلاق قایم رہتا تو یہ تہذیب و شایستگی کبھی نہ پیدا ہو سکتی، انسانی تہذیب نے وحشت و بربریت سے نجات ہی صرف اس تحقیقات کے ذریعہ پائی ہے کہ "دُرست وہ نہیں ہے جو رواج ہے"

اَب سوال یہ رَہ جاتا ہے کہ اگر کلیسائی دینیات، وجدان، فطری حقوق، اصولِ ارتقاء، اور رواجِ قدیم کوئی بھی ہمارے لیے وہ معیار رہتیا نہیں کر سکتا تو آخر وہ معیار کہاں مِل سکتا ہے کیا شک و ارتیاب کے اس دعوائے مبارزت کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا؟ بہرحال یہ طے ہونا چاہیے کہ دُرست کیا ہے، اور نا درست کسے کہا جائے؟

اِس مدت میں کہ تصور پرست فلسفی اور اخلاقیات کے لیے ایک اصول مقدم کی تلاش میں سرگردان رہے دنیا کے عام اِنسان جو مختلف اوقات میں زندگی بسر کرتے رہے، اور اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ عملی اخلاقیات کے طریقوں کو ترقی دیتے رہے —— واقعہ یہ ہے کہ فلسفیوں نے اس کوشش میں سارا وقت برباد کر دیا کہ پہلے چھت بنالیں اس کے بعد دیواریں اس چھت سے لٹکائیں، اور اس طرح مکان تعمیر کر ڈالیں لیکن عام سادہ مزاج اِنسانوں نے اس ساری مدت میں آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ اِضافہ کرتے ہوئے بنیاد سے دیوار اور دیوار کے اوپر چھت تیار کر کے مکان بنا ڈالا۔ —— ہم یعنی فلسفیانہ جدوجہد کے ذریعہ جس اُصول و حقیقت

کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ ہمارے گردوپیش ہر جگہ کارفرما ہے لیکن ہم اسے ابتک پہچان نہیں سکتے، کیونکہ فلسفہ نے ابھی تک اسکا کوئی نام تلاش کر کے اُسے ممتاز نہیں کیا ہے۔ یہ اصول مقدم ہی نہیں بلکہ مقدم ترین اصول ہے — اُس میں صرف یہ سادہ ضابطہ کام کر رہا ہے کہ "وہ درست ہے جس کا نتیجہ اچھا نکلے، اور وہ نادُرست ہے جس کا نتیجہ بُرا نکلے"۔ غرض کہ:۔

نخل خوب است اگر آن بر شیرین دارد
ورنہ حنظل نتواں کشت باید نبات

خیالات، اصول، قوانین، رواج، اور اعمال سب کو نتائج سے پرکھو، اگر اُن کا مآل عافیت انسانی ہے تو درست ہیں، اور اگر نہیں ہے تو نادرست۔ اِس کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ "عافیت انسانی" سے کیا مُراد ہے۔ اِس سوال کا جواب مختصر نہیں ہے۔ عافیت کو ایک جملہ میں نہیں بتایا جا سکتا۔ عافیت، بہت سی کیفیتوں کا مرکب نام ہے جن میں سے ہر ایک کو ایک رحمت قرار دے سکتے ہیں، اور یہ کیفیتیں بہت سی مختلف چیزوں سے مختلف حالات میں پیدا ہوتی ہیں۔

اپنے گردوپیش پر نظر ڈالو، عام طور سے یہ چیزیں کیا ہوتی ہیں جن میں عافیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ نظر آئے گا، کہ بعض کا تعلق ہمارے طبعی خصوصیات سے ہے، مثلاً بیماری سے صحت، حالت گرسنگی میں غذا، تکان کے وقت آرام، موسم کی تکالیف سے پناہ، یہ ہیں جنھیں حقیقی معنی میں بدیہی نیکی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نیکی ہونے سے کم ازکم کوئی باہوش آدمی تو انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ اطمینان جو ہمدردی، محبت، اور تکمیل فرائض سے پیدا ہوتا ہے، عافیت ہے، اور صنعت، سائنس، تہذیب کی حاصل کردہ

اشیاء، عافیت پیدا کرتی ہیں۔ خوشی، اور ماموُنیت بھی دل و دماغ کے لیے ایک لذّت مہیا کرتی ہیں۔

ممکن نہیں کہ اِن سب کیفیات اور تمام چیزوں کو عافیت کی کوئی جامع تعریف کے اندر سمو دیا جائے۔ یا لفظ "نیکی" کی ایسی جامع تشریح کی جائے جو ان سب پر حاوی ہو۔ اور نہ اُس کی ضرورت ہے کہ ایک لمبی فہرست بنا کر پیش کی جائے، جب کہ اُس فہرست کے مکمل ہونے کا تصور بھی مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔

ہاں! یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس اُصول سے اس وقت کیا رہنمائی ہو سکتی ہے جب کہ ہم کسی خاص چیز کے متعلق یہ فیصلہ کرنے لگیں کہ وہ درست ہے یا نادرست؟ صحت و تندرستی وغیرہ طبعی اُمور کے سوا اس اصول سے درست کے پہچاننے میں کیا مدد مِل سکتی ہے؟ اور اس اصول سے یہ کسطرح فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ تمدّن کی کون سی قسم اعلیٰ کہلانے کی مستحق ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس طرح کے اُموریں وجدان اور اِستدلال دونوں مشترکہ طور پر ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ تجربہ سب سے بہتر اِمتحان ہے۔ بحث مباحثہ، تجربہ اور نمونے یہ ہیں وہ ذرائع جو ہمیں کسی نتیجہ تک پہنچا سکتے ہیں۔ بہت سے اُمور تو وہ ہیں جن میں حقیقتہً اِنتخاب کا معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مثلاً ایک خوشبو پر دوسری خوشبو کو، ایک پھول پر دوسرے پھول کو یا ایک راگ پر دوسرے راگ کو ترجیح دینے کا معاملہ۔ شخصی و اِنفرادی ذوق پر منحصر ہے، البتہ جس جگہ اِنتخاب عمل سے نتائج میں اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہو وہاں اِمتحان کا یہ طریقہ ہو گا کہ کسی اَمر سے کیا نتائج برآمد ہونے کا ظن غالب ہو سکتا ہے۔ شخصی رائے یا عام فہم انسانی کے

نزدیک جو نتائج برآمد ہونے کا ظن غالب ہوگا۔ اسی کو درست و نادرست کا معیار قرار دیا جائے گا۔ اِس کے بعد اگر تجربہ نے انتخاب کی غلطی ظاہر کی۔ یا حالات بدل گئے تو پھر اسی طریقۂ عمل سے اس میں ترمیم و اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک عرصہ کے بعد کبھی غیر محسوس اور متواتر تغیرات کے ذریعہ اور بعض مرتبہ معاً اور اچانک انقلاب کے ذریعہ اختلاف و اتفاق سے گزر کر ہمارے سماج کے طریقے بدل جائیں گے، اور ہماری زندگی ایک نقشہ پر قایم ہو جائے گی۔

وہ معاملات جنھیں حل ہونا چاہیے، یا جو حل کیے جا رہے ہیں انسانی تاریخ کے اِس طویل دور اور آبادی کے اس وسیع و عریض رقبہ میں اتنے زیادہ ہیں کہ جن کا شمار ممکن نہیں۔ انسانی قربانی، قبائلی جنگیں اور غلامی، اچھی باتیں ہیں یا بُری، مذہبی رواداری صحیح طریقہ ہے یا غلط، اختلاف کو طے کرنے کے لیے دو افراد کا خونیں مقابلہ بہتر ذریعہ ہے یا نہیں؟ جنگ بحیثیت مجموعی اچھی چیز ہے یا بُری؟ یہ اور اس قسم کے معاملات نمونہ کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

انفرادی زندگی میں تو یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ دو چیزوں کے مابین ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ اچھی ہے اور وہ بُری، یا دونوں اچھی ہیں تو نسبتہً زیادہ اچھی کیا ہے، اور اگر دونوں بُری ہیں تو ان دونوں میں سے کمتر بُرائی کس میں پائی جاتی ہے۔ اِس انتخاب کے لیے ہم ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ اُن کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج کیا نکلیں گے۔ اُن سے بھلائی کی توقع ہے یا بُرائی کی؟

اگر انفرادی رائے کو اِس قدر دخل حاصل ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ

اِنسان ہر وقت اور ہر موقع پر اپنی رائے سے تصفیہ کرنے پر مجبور ہے، اُس کا نتیجہ کیا ہوگا، ایک اخلاقی بدنظمی، اِس طرح معاملہ اچھے سے اچھے مفکر کے حیطۂ اقتدار سے بھی باہر ہو جائے گا، کیا اِس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ نیکی کا عام تصور احساس فرائض، پسندیدہ اخلاق وغیرہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ اَخلاقیات کی موت نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن حقیقتہً ایسا ہوا نہیں کرتا، دنیا میں حقیقتہً کیا ہو رہا ہے، اس پر غور کرو۔ صدیوں کی مدت طویل میں تجربہ نے مختلف اعمال کو درست قرار دیا ہے اِس طرح اِنسانی دماغ نے چھانٹ کر دو سلسلے تیار کر دیے ہیں۔ ایک کو درست کہتا ہے اور دوسرے کو نادرست۔ اِس طرح ایک عمومی قانون وجود میں آگیا۔ معاشرتی رواجوں کا بھی یہی حال ہے۔ مذہبی احکام اور قانونی ضوابط نے اُن میں وسعت، ہم آہنگی اور حد بندی کا کام کیا ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر، کسی مُصلح یا کسی شاعر نے اِن بکھرے ہوئے ضوابط کو ایک جا کر دیا ہے۔ یہ ضوابط کیا ہیں؟ مختلف نسل اِنسانی کے تجربات۔ اَب اِس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ خاص غور و خوض کے بغیر اِن تعلیمات کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لیے یہی سند نشان راہ بن جاتی ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی کے تجربات کسی خوبصورت ضرب المثل کی شکل میں محفوظ ہو جاتے ہیں، جس سے وقتاً فوقتاً رہنمائی ہوتی ہے۔

مذکورۂ بالا طریقوں سے نیکیاں ممتاز ہو جاتی ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ فلاں بات صداقت، دیانت، جرأت وغیرہ کی قسموں میں سے ہے۔ اور اُس کے برخلاف فلاں فلاں چیزیں بُری اور قابل نفرت ہیں۔ انفرادی عادات اور خصائل اسی طرح بن کر تیار ہوتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایک

عام آدمی اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہر وقت درست و نادرست کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اپنی عادت کے مطابق کام کرتا چلا جاتا ہے۔ انفرادی زندگی میں عادت جو کام کرتی ہے ٹھیک وہی کام جماعتی زندگی میں رواج کرتا ہے۔ اور جماعتیں رواج کے مطابق کام کرتی چلی جاتی ہیں۔

ہماری پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب ہمارا کسی مشکوک صورتِ حال سے مقابلہ ہو یا جب کبھی یہ سمجھنے کے وجوہ پیدا ہو جائیں کہ کوئی عادت یا رواج یا عقائد کا کوئی جز یا مجموعہ قوانین کا کوئی قانون درست نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ اسے بدل دیا جائے تو اس وقت ہم مجبور نہیں ہیں کہ کسی صدقِ محض یا کلیسائی حکمنامہ کی تلاش کریں۔ یہ حماقت ہوگی کہ اِس قسم کے اسراری اور نہ سمجھ میں آنے والے تصوّرات کی طرف نظر اٹھائیں۔ اُن میں کیا دھرا ہے۔ اساطیر اولین ہیں اور کچھ نہیں۔ انہیں سند کا وہ مقام حاصل نہیں جہاں دم نہ مارا جا سکے۔ بلکہ ہمیں اصل واقعہ کی طرف نظر کرنا چاہیے۔ تجربہ کی حقیقی شہادت پر غور کرنے کے بعد ہم صحیح طور پر نتائج کی قیمت معلوم کر سکتے ہیں۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے نفعیت کی بنیاد پڑتی ہے، لیکن فلسفہ نفعیت کے حاملین نے اِس نقطۂ آغاز کے بعد اور بہت سے اُصول مسلمہ قرار دے رکھے ہیں، اُن کا نقطۂ آغاز کہ:

"اخلاقی کلیات کو عملی نتائج کی روشنی میں جانچنا چاہیے"

غلط نہیں، لیکن اِس کے بعد جو اُصول مسلمہ قرار دیے گئے وہ پرکھنے پر غیر محکم ثابت ہوئے، مثلاً نتائج کی تقویم نفع پر ہونی چاہیئے، نفع مسرت کے حصول کا ذریعہ ہے، اور مسرت خود رنج و راحت کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے سیاست میں اس سے انتہائی اِنفرادیت کا نظریہ پیدا ہوا۔ اور جب عملی طور پر

اِس نظریہ کو آزمایا گیا تو نہایت تکلیف دہ اور سخت مصیبت انگیز ثابت ہوا۔

غرض یہ کہ تنقید و تنقیح میں آکر فلسفہ نفعیت بے معنی اور ناکارہ نکلا لیکن اِس کا نقطۂ آغاز غلط نہ تھا، ہم کو پھر وہیں سے کام شروع کرنا چاہیے۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ تصورات و کلیات کے درست و نادرست ہونے کا معیار ان کے عملی نتایج ہیں، ہمیں عملی نتایج پر غور کرنا چاہیئے۔ لیکن ایک سوال یہاں اور رہ جاتا ہے کہ اخلاقی اُمور میں اعتبار عمل کا ہوگا، یا نیت کا، فرض کیجئے کہ ایک شخص نے نہایت اچھی اور صحیح نیت کے ساتھ ایک عمل کیا، مگر اس عمل کا نتیجہ جو نکلا وہ نقصان دہ تھا۔ یا اس کے برخلاف ایک شخص نے بُری نیت سے کوئی عمل کیا مگر نتیجہ مفید نکل آیا، تو ایسے عمل کو کیا قرار دیا جائے گا، درست یا نادرست؟

اِس سوال پر غور کیجیے، حقیقتہً یہ دو الگ الگ چیزوں سے متعلق سوال ہے، اور الجھاؤ کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر دو سوالات کو ایک ساتھ کردیا گیا ہے نیت کا درست یا نادرست ہونا، ایک الگ بات اور عمل کا درست و نادرست ہونا بالکل دوسری بات، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص میں پہلی بات دَرست ہو، اور دوسری نادرست، علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ نیت اچھی نہ ہو، اور عمل درست ہو۔

بظاہر یہ بحث نہایت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے اور ہمیں اپنے اصل موضوع سے دُور ہٹا دیتی ہے۔ لیکن ہمیں اُس سے الگ رہنا چاہیے۔ بہرحال ہمیں اس راہ کی تلاش جس کے ذریعہ ہم موجودہ دماغی انتشار سے باہر نکل سکیں، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی مسلمہ اخلاقی بنیاد موجود نہیں۔ مختلف مذاہب نے جو بنیاد عطا کی ہے اُسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے، فلسفہ سے ہمیں کوئی

معیار میسر نہیں آسکتا، اِس جگہ خود ہم سے یہ سوال ہوتا ہے کہ "اور کون سا معیار ہو سکتا ہے؟" ہم جواب دینے پر مجبور ہیں۔ اور بہر حال مجبور ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مدت دراز سے بنی نوع انسان نے کچھ اُصول مرتب کر رکھے ہیں۔ ان اُصول پر عمل کی بنیادیں قایم کی جاسکتی ہیں۔ وہ اُصول یہ ہیں

"عمل کے درست و نادرست ہونے کا معیار، اس کے
اُس کے نتایج ہیں، نتایج پر غور کیا جائے کہ فلاح نوع انسانی
پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، اگر اچھا اثر پڑتا ہے تو عمل درست ہے
اور برا پڑتا ہے تو نادرست۔"

ہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے، کہ فلاح نوع انسانی کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ ایک مرکب مفہوم رکھتا ہے۔ اسی طرح اِس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اُصول اپنی جگہ پر خود کوئی عملی ضابطہ و معیار نہیں ہے۔ منتقم کا خیال ہے کہ دو اعمال کے مابین جب اِنتخاب کا سوال پیدا ہو تو ان اعمال سے جو رنج و راحت پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ زیادہ افراد اِس عمل سے بتلا رنج ہو جاتے ہیں یا راحت پاتے ہیں۔ پھر ان متعلقہ افراد کی تعداد پر فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اِس قدر آسان نہیں ہے، ایسی مشین کہاں ہے جس کا دستہ گھماتے ہی ہمیں اعداد شمار مِل جائیں گے، اور ہم فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں اور خود ہمارے موجودہ دور میں نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے کہ شخصی فیصلہ کا وسیع و محیط طریقہ رائج ہے، اور اسی طرح عام بحث و مباحثہ کا رواج بھی موجود ہے؛ ہم نے اپنے بزرگوں سے زندگی کے مختلف اعمال و شئون جو وراثتہً پائے ہیں اُن کے لیے درست و نادرست

کے قواعد بھی ان کے تجربات سے ہمیں ملے ہیں۔ عام بحث یا شخصی فیصلہ کے مذکورہ بالا طریقوں سے ان اعمال و شئون کے متعلق ہم فیصلہ کرتے ہیں، یا پھر آنیوالی نسلوں کو اُصول زندگی سپرد کرنے سے پہلے ہم ان میں مناسب ترمیم کر دیتے ہیں فیصلہ کے دَوران میں ہمیں بہت سی درمیانی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، مختلف افادات کا باہمی تقابل ضروری ہوتا ہے، فرد کا فائدہ، اجتماع کے فائدہ کے مقابلہ میں، یا کسی ایک قوم کا فائدہ بنی نوع انسان کے فائدہ کے مقابلہ میں وغیرہ وغیرہ اس فیصلے تک پہنچنے کے ذرایع تجربہ، تشہیر، تعلیم، تحقیق، اور قانون سازی وغیرہ ہیں۔ علما، دینیات، فلسفی، مدبرین، شعراء اس کام میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اُن سے غلطی نہ ہو، یا ان کا عمل انتشار سے مامون رہے، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کلیہ بناتے ہیں جو قایم نہیں رہتا، یا اُصول مرتب ہوتا ہے جس سے غلط نتایج پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ وسیع عمل فیصلہ سائنس نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے قواعد و ضوابط مرتب نہیں ہیں جن پر عمل کر کے ہم فیصلہ تک پہنچ جا سکتے ہیں پھر اس کے اجزاء اتنے مختلف الانواع۔ اتنے متلون اور اس قدر متبدل و متغیر ہیں کہ اس عمل کو سائنس نہیں بننے دیتے، ہاں! مختلف شعبۂ حیات میں اس عمل کی بعض منزلیں سائنس کے ذریعہ طے ضرور کی جاتی ہیں، لیکن پورا عمل بحیثیت مجموعی سائنس نہیں بلکہ ایک فن ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ عمل فیصلہ "زندہ رہنے کا فن" ہے۔

معیارِ صحت

(از عبدالقدوس ہاشمی)

اِس باب میں فاضل مصنف نے جس اہم مسئلہ پر بحث کی ہے، وہ غالباً اِنسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، آپ نے اِس پریشانی و انتشار کو ملاحظہ فرمایا جو مصنف پر اِس مسئلہ کے حل کرنے میں طاری رہی ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ کسی خیال یا کسی عمل کو صحیح یا غلط، درست یا نادرست قرار دینے کا معیار مقرر کرنا بڑا مشکل کام ہے، اگر عقلِ اِنسانی، اور نتایجِ عمل کی اِفادیت و عدمِ افادیت سے قطع نظر کر لیا جائے تو اِنسان کسی بنے بنائے ضابطہ کا اپنے کو اِس طرح پابند پائے گا کہ مشین کی حرکت، اور اِنسانی عمل میں اِمتیاز باقی نہیں رہے گا، پھر اُس ضابطہ کی پابندی بھی شاید افرادِ اِنسانی سے پوری طرح نہ ہو سکے۔ اِنسان جسے اپنے اِرادہ کے موثر ہونے کا یقین ہے، اور جو اعمال کو اپنے اختیار سے بجالانے میں ایک قسم کی طانیت و مسرت محسوس کرتا ہے، اس پر کیسے راضی ہو سکتا ہے کہ بے جان مشین کی طرح ایک بنے بنائے ضابطہ پر، خواہ وہ ضابطہ انفرادی عادت، عائلی رسوم یا قومی رواج ہو عمل کرتا رہے۔

دوسری طرف یہ بھی آسان نہیں ہے کہ اِنسانی فہم کو کسی عمل کے لیے بطور معیارِ صحت تسلیم کر لیا جائے اِنسانی علم اپنی اِنتہائی وسعت میں بھی اِس قدر کوتاہ ہے کہ خود اس کا فیصلہ کوئی قابلِ اعتبار فیصلہ نہیں ہو سکتا ورنہ ایسی بُری طرح نراج کا دور دورہ ہو جائے گا جس کے تصور سے دل کانپ اُٹھتا ہے، ذرا اس حالت کا تصور تو فرمایئے کہ ہر شخص کو بغیر کسی روک ٹوک کے جو اُس کے نزدیک صحیح معلوم ہو عمل کرنے کا موقع حاصل ہو جائے، قوانین اخلاق کی دھجیاں اُڑ جائیں، تمدن کا خانہ خراب ہو، اور شاید دو ہی دنوں میں یہ بسی بسائی دُنیا

ود انسانی ہاتھوں سے ویرانہ میں تبدیل ہو جائے گی۔
پھر یہ بھی ایک دقیق نکتہ ہے جسے نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ فہم انسانی
یساں نہیں ہے، ایک عمل یا ایک خیال آپ کے نزدیک درست ہو سکتا ہے
گر میرے نزدیک بالکل نا درست قرار پاتا ہے۔ اس جگہ کس کے فہم کا اعتبار
لیا جائے گا؟

فاضل مصنف نے بڑی مشکل سے ایک بات پیدا کی ہے اور غالباً فلسفۂ
نفعیت کے ابتدائی اصول سے اخذ کر کے کلیہ بنایا کہ عمل کے درست و نادرست
ہونے کا معیار اس کے نتائج ہیں، عمل کو ہمیشہ اس کے نتیجہ سے قیاس کرو،
لیکن ذرا اس کلیہ پر غور کیجئے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ معیار بھی صحیح نہیں ہے۔ نیت
و عمل کی بحث میں تو خود مصنف نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بات ٹال گئے، لیکن
اس بحث سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔

"وہ عمل درست ہے جس کا نتیجہ انسانی فلاح کا باعث ہو، اور فلاح ایک
مرکب مفہوم ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔" سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انسانی
فلاح سے کیا مراد ہے؟ تمام بنی نوع انسان کی فلاح یا کسی ایک جماعت و
گروہ کی فلاح، اگر مراد پہلی شکل ہے تو پھر کسی عمل کے درست و نادرست ہونے
کا فیصلہ بالکل ناممکن ہو جائے گا، بقول مصنف کوئی ایسی مشین موجود نہیں
جس کا دستہ گھماتے ہی یہ معلوم ہو سکے کہ اس خاص عمل کا اثر کتنے انسانوں پر مرتب
ہوتا ہے، اور جن پر مرتب ہوتا ہے، کیا مرتب ہوتا ہے، اچھا یا برا۔

مثال کے طور پر اس صناع کے عمل کو لیجئے جس نے موٹر ایجاد کر لی، بہ ظاہر
یہ عمل بنی نوع انسان کے لیے مفید معلوم ہوتا ہے، لیکن دنیا کے ان لاکھوں
انسانوں پر کیا اثر پڑا جو گھوڑوں کی تجارت کرتے، یا بگھیاں چلا کر پیٹ پالتے تھے۔

اُن کے گھرانوں پر کیا پڑا؟ اُن کے بچوں پر کیا پڑا۔ اور ان معصوم آبادیوں
کیا پڑا جن کے خلاف موٹر پر سوار کر کے لاکھوں فوجیں روانہ کی جا رہی ہیں۔
موٹریں اور بھی عام ہوئیں، پیدل چلنے والی آبادی بھی بہرہ اندوز ہوئی پیدا
چلنے کی عادت کم ہو گئی، اُن کی صحت جسمانی پر کیا اثر پڑا؟ اب اعداد شمار رہتے
کرنے کی مشین کہاں سے لائی جائے جو بتائے کہ موٹر سے نوع انسانی کے
کتنے افراد فائدہ میں رہے اور کتنے نقصان میں، اور پھر اکثریت کا لحاظ
کر کے فیصلہ کر دیا جائے کہ موٹر کے موجد کا عمل درست تھا یا نادرست۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ انسانوں نے صدیوں کے تجربہ سے
اُصول وضوابط بنا لیے ہیں، اور افراد و جماعتیں جن عادات اور رواجوں کی
ہیں وہ درست و نادرست کا معیار ہو سکتے ہیں۔ اولاً تو افراد و جماعات میں ج
عادت و رواج پایا جاتا ہے وہ تجربہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ کسی مافوق الانسان
ہستی کے احکام پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں گائے کا کھانا انتہائی نادرست
عمل ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اُن کے آباء و اجداد کا تجربہ ہے، یا مسلمانوں
میں شراب حرام ہے، کیا یہ قیاس صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے تجربہ
کا نتیجہ ہے؟

ثانیاً رواج و عادت کو اگر معیار قرار دیا جائے تو ہر جماعت و ہر فرد کے
لیے معیار مختلف ہو جائے گا، دوسرے الفاظ میں حقیقتہً کوئی معیار نہ ہوگا
ضرب الامثال، شاعروں کے اقوال کوئی معیار نہیں ہو سکتے کیونکہ اُن کا غلط
ہونا بارہا ثابت شدہ مسئلہ ہے، دنیا کی ہر زبان میں ایسی سیکڑوں مثلیں
موجود ہیں جو تجربہ میں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ شاعروں اور فلسفیوں کے اقوال
تو مزخرافات کے دفاتر سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے، دنیا کے کسی بڑ

شاعر کا مجموعۂ کلام اٹھا کر دیکھیے متضاد و متباین اُصول کا مجموعہ نظر آتا ہے، کہیں کچھ اور کہیں کچھ، شاعر خود ضابطے بناتا ہے، اور خود پھر اس کے خلاف ضابطے پیش کرتا ہے۔ رہا فلسفی تو اس کے ہاں شک بالائے شک، اور ریب فوق ریب کے سوا کیا دھرا ہے؟

اگر عمل کے درست ہونے کا معیار اس کے نتیجہ کا ایک جماعت کے لیے نفع بخش ہونا قرار دیا جائے تو اس کا ماحصل وہی ہوگا جو عالمگیر جنگوں کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ تجارت پر قبضہ، اسلحہ بندی کی کوششوں۔ اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے معاشی فوائد کے حصول کو کون نادرست کہہ سکے گا، اور کس کی مجال ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں وطنی ترانوں کو برا کہہ سکے، خواہ اس کا لازمی نتیجہ چین و جاپان کی آویزش ہی ہو — عمل اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک خاص جماعت کے لیے بہرحال مفید ہے۔ عقلیت کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں، اور فاضل مصنف عقل و دانش کی تمام ترجولانیوں کے باوجود عمل یا نیت کے درست یا نادرست ہونے کا کوئی معیار پیش نہ کر سکے، لکھنے کو انھوں نے بہت کچھ لکھا عقل و دانش کے سمند بادپیما کو ہر سو جولان کیا، انسانی اعمال و افکار کے ہر گوشہ کی تلاشی لی لیکن:—

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد　　تجلی کی فراوانی سے فریاد
اُسے منظور ہے نظارۂ غیر　　نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ذرا غور فرمایئے، درست و نادرست کا معیار کیا رہ جاتا ہے، عادت نہیں رواج نہیں، نتائج عمل کی افادیت بھی ناکام، اور فہم انسانی کا فیصلہ بھی بے کار۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے قصور علم، اور کوتاہی فہم کا اقرار کرے، نہ کوئی
فرد معیار مہیا کر سکتا ہے اور نہ کوئی جماعت، نہ کسی اسمبلی کا مقرر کردہ معیا
صحیح ہے اور نہ کسی فلسفی کی عقل رسا ہماری اس سلسلہ میں مدد کر سکتی ہے۔
لے دے کر ایک ہی چیز رہ جاتی ہے، اور وہ ہے "مذہب"۔

فاضل مصنف کے سامنے جو مذہب ہے وہ نہ آسمانی مذہب ہے۔ اور
خالق کائنات سے حاصل کردہ علم پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ کلیسیا کا ایک نظام
جو چند بزرگوں کے اقوال و اعمال سے ماخوذ ہے اور باقی خلاء کو پر کرنے کا
اختیار کلیسیاء کے ائمہ مذہب کو حاصل ہے۔ نہایت سخت مذہبی اجارہ داری
قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب صرف اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے
جب تک کہ عقل انسانی معطل رہے۔ اور فطرتاً انسان اپنی عقل کو بالکل معطل کر
خوش نہیں رہ سکتا ہے، اس لیے عقل اس مذہب کے خلاف بغاوت کرتی
اور انسان عقلیت کا شکار ہو کر وہ سب کچھ کہنے لگتا ہے جو آپ نے اس با
میں پڑھا، ورنہ بات سیدھی اور صاف تھی، عمل کے درست و نادرست ہونیکا معیار احکا
خداوندی ہیں، یہ احکام کسی ایک انسان کو دوسرے ذرایع متعارفہ کی بجائے گیارہو
ذریعہ علم یعنی وحی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، اور وہ انسان اپنے انکا اعمال، او
کردار میں دنیا کے لیے معیار بن جاتا ہے۔ اسطرح کلیات مرتب ہو کر تیار ہو جاتے ہیں
اب کسی خاص وقت میں، کسی خاص عمل سے حکم یا نمونہ کا انطباق اچھی نیت کے ساتھ ا
و اجتماعی فہم انسانی کا کام رہ جاتا ہے عقل انسانی نہ تو بالکل معطل کی جا سکتی ہے، او
اُسے معیار قرار دیا جا سکتا ہے، پہلی صورت میں بےچینی و بغاوت پیدا ہوتی ہے اور دوسر
صورت میں گمراہی و فساد، اور یہ دونوں حالتیں فلاح انسانی کے لیے مضر ہیں۔ کوئی تیسر
حل اس کے علاوہ نہیں نکل سکتا، اور نہ فطرت انسانی کیلئے کسی دوسرے فلسفیانہ حل کا ساتھ
دینا ممکن ہے۔

نواں باب

عملِ صالح کے محرکات

عمل صالح کے محرکات

ایک وہ دورہ تھا جب مغربی دنیا میں حیات بعد الممات کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ لیکن جب سے عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کا اپنے دنیاوی اعمال کی بھلائی یا برائی کے بموجب مرنے کے بعد ہزاروں سال کی دردناک یا طربناک زندگی سے واسطہ پڑتا ہے تو لوگوں کو دنیاوی ترغیبات کا مقابلہ کرنے اور نیک عمل کے لیے ایک اثر انداز محرک مل گیا۔ مشرق میں جو مذاہب رائج ہیں ان میں سے بھی اکثر نے سزا، وجزا کا تقریباً یہی نظام پیش کیا ہے، اخلاقیات کے لیے اس نظام کے ماتحت ایک سند پائی جاتی ہے، درست و نادرست کا ایک معیار ملتا ہے، اور اس کا سبب بھی مل جاتا ہے کہ درست عمل کیوں کیا جائے، اور نادرست سے کیوں حذر لازمی ہے، لیکن آج کی دنیا میں جب کہ ایمان متنزلزل ہو گیا ہے اور یقین میں کوئی قوت موجود نہیں ہے! جنت و دوزخ کی اہمیت نئی نسل کی آنکھوں سے گر چکی ہے تو ہمارے ہاتھ میں کیا وجوہ رہ جاتے ہیں کہ ایک عام انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں زیادہ پُر لطف اعمال کو چھوڑ کر کم تر اعمال کو اختیار کرے۔ عمل صالح کے فوائد اور مفید مضمرات کا اظہار شاید اس کے لیے کافی نہ ہو سکے۔ عصر حاضر کو ضرورت ہے کہ ان وجوہ و اسباب کو صراحت و وضاحت کے ساتھ سمجھے، اور

معلوم کرے کہ عمل صالح کی وضاحت کے بعد بھی کسی انسان کو اپنے خواہشات سے پرہیز کر کے ان اعمال کا بجالانا کیوں ضروری ہے، کیوں نہ درست، صالح اور نیک اعمال کو چھوڑ کر ہم اپنی مرضی و خواہش کے مطابق عمل کریں خواہ وہ عمل نادرست، غیر صالح اور بد کیوں نہ ہو، ——— اگر دینیات کے بتائے ہوئے اسباب و وجوہ مشتبہ قرار دیے جائیں یا ان سے یکسر انکار کر دیا جائے تو کیا اُن کے بعد بھی کوئی ... باقی رہ جاتا ہے؟

ہم محتاج نہیں ہیں کہ کسی راہبانہ نظریے کی طرف اُمید کی نظر اُٹھائیں، بلکہ ضروری یہ ہے کہ زندگی کو بالکل اُسی رنگ میں دیکھیں جیسی کہ وہ حقیقتہً ہے، اگر بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ہم نے کسی طرح محرکات کی تعین کر دی تو بھی اُس کا اثر صرف اُن لوگوں پر پڑ سکے گا جن کی زندگیاں حقیقتہً مسلّمہ طور پر درست ہیں، باقی رہ گیا وہ سوال جس کے حل کرنے کی ہمیں فکر ہے، یعنی کیوں درست ہی عمل کرنا ضروری ہے؟ بدستور باقی رہ جائے گا۔

زندگی کو اپنے حقیقی رنگ میں ہم دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ عمل صالح کیوں ضروری ہے یا دوسرے لفظوں میں عمل صالح کے موجبات کیا ہیں، اس جگہ ایک واحد عامل کام نہیں کرتا، بلکہ مختلف عوامل کام کرتے ہیں عقل و دماغ کی جولانی دکھانے والے ہزار کوشش کریں، اور ایک عامل تلاش کر کے نکالیں لیکن عملی زندگی میں وہ قاعدہ باقی نہ رہے گا۔ عملی زندگی کو غور سے دیکھیے آپ کو معلوم ہوگا کہ عامل ایک نہیں بلکہ بہت سے عوامل کام کر رہے ہیں یہ شخص اپنے کاروبار میں دیانت دار ہے، کیوں دیانت دار ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے دیانت داری کو اہمیت دیتا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے خاندانی طور پر دیانت داری کی عادت بطور وراثت

پاتی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے مذہبی معتقدات دیانت داری پر مجبور کرتے ہوں۔ اور کسی غیر دیانت دارانہ عمل سے وہ اپنے ضمیر کے سامنے اپنے کو شرمسار پاتا ہو۔ ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ اُن میں سے کوئی وجہ بھی موجود نہ ہو، بلکہ اُس نے بغیر وجوہ و محرکات پر غور کیے اپنی زندگی کا ایک اصول مقرر کر لیا ہو، اور وہ اصول ہو "دیانت"۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دیانت دار آدمی کے اخلاق و اعمال کا اندازہ کرنے میں ہم غلطی کر رہے ہوں، اور حقیقت یہ ہو کہ وہ شخص اُن اشخاص میں سے ہو جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ دیانت داری کی بدولت اِنسان زیادہ دولت پیدا کر سکتا ہے، اور جب کبھی اُسے حرص غیر دیانتداری کی طرف لے جانا چاہتی ہو اُسے یاد آجاتا ہو کہ "دیانتداری بہترین حکمت عملی ہے"۔ یا ممکن ہے کہ وہ اس طرح اپنے کاروبار کی ترقی، اپنی شہرت، دوستوں ہمسایوں اور خاندان میں اپنا وقار بنانا چاہتا ہو، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کے مذہبی خیالات دیانتداری کے بہترین صلہ کی اُمید دلاتے ہوں اور اسے خوف ہو کہ غیر دیانتداری کی اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں دردناک سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔

اگر کسی طرح ہم اس کے قلب کا جائزہ لے سکیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے یہ تمام خیالات و قیاسات بالکل غلط ثابت ہوں۔ اس کے دل میں ان اُمور میں سے کسی کا کوئی اثر نہ ہو، بلکہ حقیقت صرف یہ نکلے کہ وہ شخص قانون مروجہ کے خوف سے دیانتداری پر مجبور رہے۔ اس کو خوف ہے کہ اگر اس نے کوئی بددیانتی کی تو چھپا نہیں سکے گا، اور ملک کی عدالت فوجداری اُس کو سزا دیدے گی۔

تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اور اِس قسم کے محرکات اِنسانی اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں، بعض شدید اثر ڈالتے ہیں اور بعض خفیف، بعض کا ایک شخص پر گہرا اثر پڑتا ہے اور بعض کا دوسرے پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی محرک دوسرے تمام محرکات پر حاوی ہوجاتا ہے، اور کبھی ایک کی بجائے دو محرکات باہم مشترک عمل کرتے ہیں، کبھی متخالف عمل ہوتا ہے، اور ان میں سے جو زیادہ قوی موثر ہوتا ہے اس کا اثر غالب ہوجاتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو اس سوال کا کہ اخلاقی عامل اِس دور میں کیا ہے؟ صرف یہی جواب ہوسکتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ متعدد عوامل و محرکات کام کرتے ہیں، اور معاشرہ کو ان تمام عوامل کا لحاظ کر کے نقشہ تیار کرنا چاہیئے۔

کسی نے کہا ہے کہ "ہر نئی نسل دنیا پر وحشیوں کا ایک جدید حملہ ہے" مہذب ملک میں سوسائٹی بچوں پر قبضہ کرلیتی ہے۔ اور تہذیب و شائستگی کے مقررہ طریقوں پر اُن کی تربیت کرتی ہے۔ بچے پیدائش کے وقت سے، شیرخواری، بچپن، لڑکپن، کم سنی اور جوانی تک ان تمام عوامل کے اثرات قبول کرتے رہتے ہیں جو سوسائٹی میں موجود ہوں۔ ان پر گھر، اسکول، کلیسا اور حکومت کے اثرات تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ڈالے جاتے ہیں۔ غرض کہ وہ سارا ماحول جس میں ایک بچہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار حیات طے کرتا ہے اُس پر اثر انداز ہوتا ہے ——— بچے کی وہ اندرونی صلاحیتیں جو اُسے ماں باپ سے وراثت میں ملتی ہیں سوسائٹی کے سانچہ میں ڈھالی جاتی ہیں، جو اچھی ہوتی ہیں اُن کی نشوونما کی جاتی ہے، اور جو بُری ہوتی ہیں اُنھیں مٹایا جاتا ہے۔ اس طرح اخلاق اِنسانی کا ایک ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے اور یہی اخلاق پھر اعمال اِنسانی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ہر فرد انسانی دو قسم کے جذبات فطری طور پر اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا۔ پہلے جذبہ کے ماتحت فرد اپنی حفاظت کرتا ہے اور اپنی فلاح کے لیے کوشش کرتا ہے، اور دوسرے جذبہ کے ماتحت انسان دوسروں کی فلاح و بہبود سے ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ جذبات ہیں جنھیں ہم خود غرضی اور ایثار سے یا دوسرے لفظوں میں خود افادیت اور ہمدردی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ جذبات صرف انسانی فطرت میں داخل نہیں ہیں بلکہ حیوانات میں بھی عام طور سے پائے جاتے ہیں، خود غرضی تو نہایت وضاحت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ کی جا سکتی ہے، لیکن ایثار و ہمدردی کا مظاہرہ بھی جانوروں میں ہوتا ہے، کسی جانور کو ننھے بچوں کی حفاظت کے وقت ملاحظہ کیجیے یہ جذبہ نمایاں طور پر دکھائی دے گا۔ پالتو جانوروں کو تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ بچوں کی حفاظت کے لیے اپنے کو بےخوف ہو کر خطرہ میں ڈال دیتے ہیں —— چڑیا گھونسلہ بناتی ہے، لیکن یہ مشکل ہی سے کہا جا سکے گا کہ وہ گھونسلہ جذبۂ خود غرضی کے ماتحت بناتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی حفاظت کے لیے جذبۂ ہمدردی و ایثار یہ کام کراتا ہے۔ جماعت پسند جانوروں یا اجتماع پسند کیڑوں میں ایک دوسرے کی مختلف طریقہ پر مدد کرنے کا جذبہ عام طور سے پایا جاتا ہے —— انسانوں میں اجتماع پسندی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے —— ان امور سے فطری جذبہ کا ثبوت ملتا ہے۔ افراد اور ادارہ جات کے مابین باہمی ہمدردی اور پھر اس سے پیدا شدہ طریقۂ عمل بھی اُس سے واضح ہو جاتا ہے۔

فنِ اخلاقیات اگر قوی تر صورت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اپنی موافقت میں ایک نہیں بلکہ دونوں قسم کے جذبات کو شمار کرنا چاہیے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اخلاق صرف ایثار و ہمدردی کا نام ہے۔ کسی شخص کی نیکی کا پیمانہ صرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے واسطے کس قدر ایثار و قربانی اور بے غرضی و ہمدردی کے لیے تیار ہے، اپنے لیے مسرت و فلاح کی تلاش یا تو خلاف اخلاق یا کم از کم خارج از اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ جب وقت سوسائٹی جدید نسلوں کی تربیت کا کام انجام دیتی ہے تو اس سے امید کی جاتی ہے وہ تمام ممکنہ موثرات خصوصاً مذہبی موثرات کو بچوں کے اندر خود غرضی کے کچلنے اور ایثار و قربانی کے جذبات پیدا کرنے میں صرف کر دے۔

اِس خیال کو ذرا غور و تعمق کے ساتھ دیکھیے، معلوم ہو جائے گا کہ حقیقتاً یہ خیال محض بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام مذاہب کے پیشواؤں اور تمام مکاتب خیال کے علمائے اخلاقیات نے ہمیشہ اپنا پورا زور دوسروں کی خدمت انجام دینے پر صرف کیا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کسی انسان کو اپنے فائدہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری نہیں خود غرضی اور خود افادیت تو بہر حال انسان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ضرورت ایثار و ہمدردی ہی کی طرف متوجہ کرنے کی ہے۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ خود افادیت کسی مرتبہ میں اور کسی طریقہ پر اخلاقیات میں شمار نہ کی جائے۔

عادتاً ہم کہا کرتے ہیں " انسان کا خود اپنے نفس پر بھی کچھ حق ہے" اگر کوئی شخص لاپرواہی سے اپنی صحت خراب کرلے یا اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بے خبر رہے تو ہم ایسے شخص کو الزام دیتے ہیں کہ وہ اپنے ابتدائی فرائض کی انجام دہی میں بھی ناکام رہا۔

اگر ہم کچھ اچھے کام کرنا اور نیک زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو یہ یقینی ہے کہ ہم کچھ کرنا اور زندہ رہنا بھی چاہتے ہیں —— کسی ایسی نیکی کا تصور

نہیں ہوسکتا جو حفاظت خود اختیاری سے اول درجے پر رکھی جاسکے۔

بلاشبہ بہت سے خود افادی اعمال سوسائٹی کے لیے ضرر رساں ہیں لیکن ایسے بھی بہت سے خود افادی اعمال موجود ہیں جنھیں اجتماع اور معاشرے کے لیے کسی طرح ضرر رساں قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر کوئی شخص اپنی صحت، تعلیم، اور قوت کارکردگی کو ترقی دینا چاہتا ہے یا جسمانی، روحانی اور دماغی حیثیت سے اپنی شخصیت کو ممتاز بناتا ہے تو بلاشبہ وہ اپنی قوم کی ترقی کا کام کر رہا ہے۔ بہتر افراد ہی سے بہتر جماعت بن سکتی ہے۔ یقیناً ایسا شخص نسل انسانی کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہا ہے، کون نہیں جانتا کہ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ اور بہتر کی اولاد کے بہترین ہونے کی بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے۔

عقل کے نزدیک یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں کہ خود اپنی فلاح سے غافل ہو کر ہمسایہ کی فلاح و بہبود میں لگے رہنا ہمارا فرض ہے، اگر یہی طریقہ صحیح ہے تو یہ فرض ہمارے ہمسایہ پر بھی تو عاید ہوتا ہے کہ اپنی فلاح و بہبود سے غافل ہو کر وہ ہماری فلاح و بہبود میں لگا رہے۔ اگر ہماری فلاح و بہبود ایسی ہی ضروری بات ہے کہ بطور فریضہ اس کے لیے کوشش کرنا ہمارے ہمسایہ پر واجب ہو تو کیوں خود ہم پر یہ فرض عاید نہیں ہوتا کہ اپنی فکر کریں۔

بہرحال اخلاق میں مذکورۂ بالا عقلی رخ کو امتیاز حاصل نہیں، اور مسیحی علماء نے تو دوسروں کی خدمت پر اس قدر زور دیا کہ مذہب کا مفہوم ہی ایثار و بے غرضی قرار پاگیا —— عام طور پر اپنی آپ فکر کرنے کو اخلاقیات کے منافی خیال کیا جاتا ہے۔

عام انسانی دماغوں پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کے متعدد

وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی، جدید دماغ چاہتا ہے کہ مناسب حد تک اور مناسب اوقات میں خود انفادیت کو ایک صحیح عامل اور نیک جذبہ کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے، بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے یہ بھی ایک ضروری امر ہے، لیکن مذہب اس معقول بات کی مخالفت اور بعض دفعہ شدید مخالفت کرتا ہے۔ جدید خیالات اور مذہبی تعلیمات کے مابین اس جگہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے[1]۔

عملی طور پر بھی مذہب نے اپنی تمام تر توجہ ایثار و قربانی پر مرکوز رکھی اور شخصی معاملات کو کوئی درجہ نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ دور میں اس کا ایک شدید ردعمل ہوا۔ موجودہ آزاد عصر سوال کرتا ہے کہ اس ایثار اور خود فراموشی کے کیا وجوہ و اسباب ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کوئی عقلی بات نہیں کہی جاتی بلکہ صرف پرانے رواج یا مذہبی نوشتوں کا حوالہ دیدیا جاتا ہے۔

---

[1] مذہب اپنی آپ فکر کرنے سے باز رکھ کر ہمسایہ کی بہبود میں لگے رہنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہ غلط تعلیم ہے جو مسیحی علماء نے اپنی غلط تفسیروں سے پھیلا دی ہے۔ اسلام میں فرمان نبوی ہے کہ ان لنفسك عليك حق۔ خود تمہارا بھی تم پر حق ہے، اس کے علاوہ حصول علم عبادت ہے، اپنی صحت کا خیال رکھنا واجب ہے کسب حلال واجب ہے۔ حتیٰ کہ اپنی زیبائش و آرایش کے لیے بھی احکام موجود ہیں۔ مسیحیت و یہودیت میں بھی جو احکام اب تک ان کے مسخ شدہ صحیفوں میں موجود ہیں وہ اس کلیسائی تعلیم کا ساتھ نہیں دیتے۔
"اپنے ہمسایہ سے اس طرح محبت کرو جس طرح خود اپنی ذات سے محبت کرتے ہو" (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم)، تم لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا کہ لوگ تمہارے ساتھ کرتے ہیں۔ (کتاب مقدس عہد نامہ جدید) (مترجم)

اِس لیے جدید دماغ یہ فیصلہ کر بیٹھتا ہے کہ حقیقتہً اس کے لیے کوئی سبب موجود نہیں ہے۔

اب ایک نطشے پیدا ہوتا ہے، اور اخلاق کا ایک ایسا ضابطہ بنا کر تیار کرتا ہے جس میں نیکی اور بدی کے تصورات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ تمام روایاتی اخلاقیات کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے، اس کے پرجوش پیرو پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جدید عصر کے افکار و خیالات میں ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ ایک بہت عظیم الشان سیاسی تحریک جس پر ان خیالات کا گہرا اثر ہے، پیدا ہوتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے جرمنی پر چھا جاتی ہے۔ بلکہ جرمنی سے باہر کے علاقہ کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ خاکساری، عاجزی اور بے غرضی کے خلاف ایک عام بغاوت پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے، جدید علم نفسیات کی تحقیقات علمی نقطۂ نظر سے اس کی تائید کرتا ہے۔ اب اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ سنیئے۔! حرکت کی صرف اس لیے تعریف کی جاتی ہے کہ وہ حرکت ہے، اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ اس حرکت کا نتیجہ فلاح ہوتا ہے یا آفت و مصیبت، اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ زندگی اچھی طرح گزاری جاتی ہے یا بری طرح، اہمیت صرف اس امر کو حاصل ہے کہ زندگی جانفشانی اور سخت کوشی کے ساتھ بسر ہو رہی ہے نمونۂ زندگی کے لیے کسی پارسا، متقی و پرہیزگار شخص کی ضرورت نہیں، بلکہ نمونہ تلاش کیا جاتا ہے۔ میدانِ جنگ کے ایک ہیرو کی زندگی میں۔ اور بہترین زندگی" میدان جنگ کے خوش آئند ایام" میں تلاش کی جاتی ہے۔

نطشے کا قول ہے:-

"مردوں کی تربیت جنگوں کے لیے ہونی چاہیے، اور عورتوں کی تربیت مردوں کی دلچسپی کے لیے، اور اس کے سوا

جو کچھ ہے حماقت ہے۔"

س طرح ہر نئی آنے والی نسل کو تعلیم دی جاتی ہے کہ فطری طور پر جو وحشت و بربریت ن میں موجود ہے، اِس کو مٹانے کی بجائے اُس کی نشو و نما کریں۔

صداقت جو اِس تحریک میں پوشیدہ تھی، وہ یہ تھی کہ "اچھی زندگی صرف ایثار کی زندگی ہے اور خود افادیت ناقابل لحاظ امر ہے، اس اُصول کی مخالفت کی جائے۔" لیکن دوسرے رُخ پر اس تحریک میں جو غیر معمولی اصرار کیا گیا وہ ایک ایسی غلطی تھی کہ خود اس نے اس صداقت کو توڑ دیا ——— یہ تو صحیح تھا کہ ایثار و ہمدردی، خود افادیت کے بغیر اخلاق کا غلط نظریہ ہے، لیکن اس کے ردعمل نے اُن کو اس سے زیادہ بے اصل اور بہت زیادہ خطرناک غلطی میں مبتلا کر دیا۔ اُنھوں نے یہ باور کر لیا کہ اگر اُصول مذکورہ صحیح نہیں ہیں تو اُس کا عکس ضرور صحیح ہوگا ——— لازماً اب خود غرضی اور خود افادیت کو بلند مرتبہ دیا گیا۔ ایثار و ہمدردی کے جذبات کو کچل دینے کی کوشش کی گئی۔ اِنصاف، رحم، مہربانی اور چین و سکون اچھے الفاظ نہ رہے بلکہ اُن کی بجائے اچھے ہونے کا اعزاز کشمکش بے رحمی اور تسلط کو عطا کیا گیا ——— اگرچہ ایثار و قربانی کو اب بھی نیکی شمار کیا جاتا ہے، لیکن صرف اس وقت جب کہ یہ ایثار مملکت یا قوم کے لیے ہو، اور خود مملکت اور قوم کیا چیز ہے افراد کی مشترک و مجتمع شکل جس کی تمام تر کوششیں محض اپنے افراد کی خود افادیت تک محدود ہیں۔

کسی شخص کے ہیرو کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی دشمن موجود ہو، ورنہ وہ اپنا ہیرو ہونا کس طرح ثابت کرے گا۔ زیگفرید کی بے باکی اگر آفت جانستان موجود نہ ہو تو کس طرح نمایاں ہو سکے گی اور وہ ذوفنون تلوار جو اِس مشقت کے ساتھ تپا کر آب دی گئی ہے کس کام

آئے گی، اگر کوئی دشمن بالفعل موجود نہیں ہے تو ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا جائے۔ اس طرح جبر و تشدد اور جذبات و نفرت کو اچھے جذبات کے مقابلہ میں ترقی پانے کا موقع دیا جاتا ہے، پھر یکطرفہ فلسفہ اخلاق کے ذریعہ اس کو مبنی بر انصاف قرار دیا جاتا ہے۔

اسے کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایثار و ہمدردی کا وجود بھی ایک مناسب حد تک نہایت ضروری ہے۔ فرد اجتماع کی ایک وحدت ہی بن کر زندہ رہ سکتا ہے، کسی فرد کی فلاح کا تصور اُس کے اچھے ہونے سے الگ ہو کر نہیں کیا جاسکتا۔ فرد کی زندگی، گھر سے شروع ہوتی ہے، اور ہمسایہ، شہر، تجارت، صنعت، پیشہ سے ہوتی ہوئی قوم تک پہنچتی ہے، اس کے بعد قوم سے آگے بڑھ کر مجموعۂ اقوام تک ترقی کرتی ہے۔ فرد انسانی کسی نہ کسی طرح اُن میں سے ہر ایک کا محتاج ہے —— اجتماع کی یہ مختلف شکلیں فرد کو درست کرتی ہیں، اُس کی جسمانی قوت کی حفاظت کرتی ہیں، اس کی دماغی تربیت کا کام انجام دیتی ہیں یہی وہ شکلیں ہیں جو فرد انسانی کے لیے ضروریات حیات مہیا کرتی ہیں، اُس کی حفاظت اور اُس کے چین اور سکون کا نظم کرتی ہیں۔

ایک گھر سے لے کر انسانیت تک اجتماع کا کوئی درجہ اپنا کام انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ رواداری نہ برتیں اور اگر ضرورت پڑے تو انفرادی یا قومی و جماعتی مفادات کو عام بنی نوع انسان کے مفادات پر قربان نہ کردیں —— ایسا فلسفہ جس میں ایثار و قربانی کو نظرانداز کردیا گیا ہو، یا اس کے حقیقی مقام سے گرا دیا گیا ہو۔ ایک غلط اور ناکارہ فلسفہ ہے —— حق یہ ہے کہ خود افادیت اور ایثار فلاح انسانی

، یے دونوں ضروری ہیں، اس لیے یہ دونوں ہی اخلاقی عوامل قرار پاتے
ں ـــــ صحیح زندگی نام ہے ان دونوں میں صحیح توازن قایم رکھنے کا۔
اب ہم اپنی ابتدائی بحث کی طرف لوٹتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیوں
ھائل کرنا چاہیے۔ پہلی ہی مثال کو لیجیے، ایک دیانتدار آدمی، اس لیے
یانتداری کرتا ہے کہ وہ اپنے قلب میں اچھے خیالات رکھتا ہے۔ فرض کرو
وہ شخص یہ سب کچھ اپنی اندرونی آواز کے مطابق کرتا ہے، یہ اس کی خصوصی
طری کیفیت ہے۔ اس کی پرورش اچھی طرح کی گئی تھی، اچھی پرورش بڑا
م ہے، اچھے خیالات وافکار کو تربیت کے ذریعہ نشو ونما دی جا سکتی ہے
ر اگر اچھے خیالات موجود نہیں ہیں تو کسی حد تک انھیں پیدا بھی کیا
سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے سوسائٹی کا کام شروع ہوتا ہے۔ ایثار
ر ضروری ہے اور اس کے لیے اچھے خیالات ہی محرک قرار دیے جا سکتے
ں تو یقیناً سوسائٹی کا فریضہ ہے کہ اچھے خیالات کی پرورش کرے، اب
ں ضرورت کے لیے گھر، اسکول وغیرہ تمام مراکز تربیت پر غور کرنا پڑے گا۔
اس نقطہ پر پہنچکر ہمارا ربط پھر اس مسئلہ سے قایم ہوجاتا ہے جسے ہم
تداءً بیان کر چکے ہیں کہ جدید عصر کو مذہب کی شدید ضرورت ہے۔ ہکسلے
قول ہے کہ مذہبی خیالات عمل انسانی کے لیے بہترین بنیاد ہیں، بالکل ابتدائی
ر سے لے کر آج کے دن تک تمام انسانی نسلوں کے لیے اخلاق کا دار ومدار مذہب
رہا ہے، مذہب کی وجہ سے ایک نظم وضبط قایم ہے۔ ضابطہ اگر مقدس ضابطہ
تو بہت قوی تر ہو جاتا ہے ـــــ ہمارے روزانہ کے اعمال کو اس حیثیت
ے دیکھیے کہ یہ ایک وسیع اور عام اسکیم کے اجزاء ہیں اور ہر انسانی زندگی
ں میں معمولی درجہ کی وحدت ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرد ایک حرکت

اور ہر عمل ایک نشان راہ ہے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ مذہبی گرفت کو کمزور کردینے کی موجودہ کوششیں لازمی طور پر عام بے چینی پیدا کر رہی ہیں —— اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر اخلاقیات کی قدیم عمارت موجودہ خیالات کے سیلاب میں ڈوب رہی ہے تو اس کی حفاظت کے لیے کیا سبیل اختیار کی جائے اس سوال کا وہی جواب ہے جو گذشتہ ابواب میں دیا جا چکا ہے، اس جگہ دوسرے الفاظ میں پھر بیان کیا جاتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ موجودہ دماغوں کے سامنے مذہب کی وہ شکل رکھیں جو قابل قبول ہو سکے۔ صرف پرانی روایتیں جن میں وہمیات اور خرافات کا بڑا حصہ ہے مذہب کے نام سے نہیں پیش کرنا چاہیے۔ بلکہ دیانتداری اور استقلال کے ساتھ ہمیں وہ عقاید پیش کرنا چاہیے جو عملی زندگی میں ایک عام آدمی کا ساتھ دے سکیں، اور معمولی درجہ کا ایک آدمی اس پر اس یقین سے عمل پیرا ہو سکے کہ اچھے اور روشن دماغ اس کے مبنی بر صداقت ہونے کا یقین رکھتے ہوں۔

اچھے ارادے یقیناً اخلاق کی مضبوط بنیاد ہو سکتے ہیں، لیکن یہ عام نہیں ہیں، اور نہ آئندہ مستقبل قریب میں ان کے عام بنائے جانے کی کوئی امید کی جا سکتی ہے۔ ایک شخص اعلیٰ پیمانے پر ارادوں میں نیکی اور خیالات میں پاکیزگی کا مالک ہو سکتا ہے، اور اس کا ہمسایہ اس سے کمتر پیمانے پر، بلکہ ممکن ہے کہ یہ صفت اس میں بالکل نہ پائی جائے، سنتیانا کا قول ہے کہ انسان کی قلبی کیفیت مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہے۔ اور اس کا اختلاف دائمی بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل ہی کمزور ہو کر —— ایک دیانتدا

آدمی کو اپنی دیانت کی تائید میں کوئی دلیل مہیا کرنے کا خیال ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ "دیانت بہترین حکمت عملی ہے" پر یقین رکھنے سے اُس کی تشفی ہو جائے۔

سوسائٹی کی فراست یہ ہوگی کہ دیکھے اور غور کرے کہ واقعتہً اس کی تشفی ہوتی ہے یا نہیں، سوسائٹی کی حفاظت صرف ایثار و ہمدردی پر انحصار نہیں کی جا سکتی، ضرورت ہے کہ ایک قسم کی خود افادیت کو جائز قرار دے کر دوسری بری قسم کی خود غرضی کی راہ بند کرنے کی کوشش کی جائے، یہ ایک قسم کی ترغیب ہوگی جس میں بعض شخصی مفادات کی حفاظت کر کے دوسرے خود غرضانہ اعمال سے احتراز کرایا جا سکے گا۔ ممکن ہے کہ اس ضرورت کو قابل افسوس شمار کیا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کوئی قوم جو بُرے اعمال کی روک تھام اور اچھے اعمال کی ترویج کا کام بالکل چھوڑ دے اور یہ اُمید کرے کہ لوگ خود بخود اچھے اعمال کریں گے اور بُرے اعمال سے محترز رہیں گے، بہت ہی قریب مدت میں انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ یہ امید اچھا نصب العین ہو سکتی ہے لیکن بہت دور کا نصب العین ہے۔ ہمیں اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہیے، مگر یہ یقین کر کے کہ صورت حال یہی ہے، عمل کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا مختلف قسم کی ہو سکتی ہے، فن دینیات اس کا ایک نظام بتاتا ہے، اور رائے عامہ دوسرا نظام بتاتی ہے، اسی طرح معاشیات میں تیسرا، اور مملکت چوتھا نظام پیش کرتی ہے۔ ایک شخص اچھے اعمال اس لیے کرتا ہے کہ مقدس احکام یہی بتاتے ہیں، دوسرا اس لیے کہ اپنا وقار قایم رکھنا چاہتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے شہرت تک پہنچنے کی یہی راہ ہے، تیسرا ان اعمال سے

اپنے معاشی فائدے کی اُمید رکھتا ہے، چوتھا عہدہ داروں کی رضا کے لیے سب کچھ کرتا ہے، اور پانچواں صرف اس لیے کرتا ہے کہ قانون کے ہاتھوں سزا بھگتنے سے محفوظ رہے — اگرچہ یہ کمتر درجہ کے محرکات ہیں لیکن موجودہ دور میں سوسائٹی کا جو حال ہے، اس میں اُسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ انسان ایک اِجتماع پسند مخلوق ہے اس لیے وہ اپنے ہمجنسوں کی تعریف سے خوش اور توہین سے ناخوش ہوتا ہے۔ یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ جہاں رائے عامہ اچھی حالت میں نہ ہو وہاں اخلاق کا معیار گر جاتا ہے۔ اگر عام طور پر انصاف مہربانی اور رحم وغیرہ کی عام تعلیم نہ ہو، اور کھلے بندوں ان کی تعریف اور اُن کے مخالف اعمال کی تحقیر نہ کی جائے تو خود انسانوں کی حالت نہایت قابلِ رحم ہو جائے گی، اِنسانیت کے قابلِ تعریف اور قابلِ تحقیر اعمال کا کوئی معیار ہی باقی نہ رہے گا۔ عمل اور نتائج کا باہمی تعلق اخلاقیات کی جان ہے۔ اس سے انحراف آسان نہیں، سوسائٹی انحراف کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ ایک خاندان جس میں نیک عمل ہوتا ہو یقینی طور پر غیر معمولی خوشی و مسرت سے لطف اندوز ہوگا، اور بالکل اسی طرح دوسرا خاندان جس کے افراد برے اعمال میں مبتلا ہوں گے لازمی طور پر کلفت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کلیہ کو تسلیم کرنے کے بعد اچھے عمل کے لیے اسباب مِل جاتے ہیں، نہ صرف اس لیے کہ اچھے اعمال کا نتیجہ مسرت اور برے اعمال کا مصیبت ہوتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ سوسائٹی اپنے قوانین و ضابطے اور اُصول و رواج اس طور پر مرتب کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ جو لوگ اچھے اعمال کرتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ مسرت سے لطف اندوز ہوں، اور جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں وہ مسرت سے محروم رہیں۔

سب سے اچھی جماعت تو وہ ہے جس میں کبھی بُرے کام کرنیوالوں کی

گنجائش نہ پیدا ہو لیکن چونکہ ایسی جماعت کا عملاً وجود نہیں ہے اس لیے ہم کمتر برائی کو قبول کرنے پر مجبور رہیں۔ اور ایسی جماعت چاہتے ہیں جس میں اچھے اعمال کرنے والے لوگ اپنے عمل کو مفید پائیں اور برے اعمال کرنے والے اپنے عمل کو کبھی مفید نہ پا سکیں۔ فائدہ سے مراد صرف مادی فائدہ نہیں ہے بلکہ ہر قسم کا مادی و معنوی فائدہ اس میں داخل ہے۔ ایک ایسی جماعت میں جب عمل اور نتائج عمل کا باہمی ربط قایم رہے گا تو مجرم ہمیشہ اپنے کو گھاٹے میں اور لازمی طور پر حماقت میں مبتلا پائے گا۔

اس جگہ بظاہر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ایسی جماعت جس میں رائے عامہ کا دباؤ انسان کے شخصی رجحانات کا گلا گھونٹ دے اور تمام انفرادی اعمال پر اپنا قبضہ جمالے، کسی طرح اچھی جماعت نہیں کہی جا سکتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اچھی جماعت جس کا نقشہ ابھی پیش کیا گیا ہے۔ ایسی جماعت نہیں ہوگی، جس میں شخصی رجحانات کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، یہ بحث مسئلہ آزادی اور اس کے حدود سے متعلق ہے، آئندہ جہاں آزادی پر بحث کی جائیگی وہاں تفصیلی طور پر اس کا بیان بھی آئے گا۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں اخلاق کا انحصار عادت پر ہے۔ ایک دیانتدار آدمی ہر مسئلہ میں دیانتداری کے نتایج، اسباب اور موجبات پر غور نہیں کرتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی عادت کے مطابق عمل کرتا چلا جاتا ہے۔

عادت تعلیم کے ذریعہ بھی پیدا کی جاتی ہے، اور خود عمل سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ عادت بار بار عمل کرنے سے خود بخود بن جاتی ہے۔ جس کام کو تم بار بار کروگے وہ تحت الشعوری طور پر تم سے انجام پاتا رہے گا۔ اور سب کچھ اس نفسیاتی مشین کے ذریعہ ہوتا رہے گا جو ضمیر اور ارادہ کو چھیڑے بغیر

اپنا کام کرتی رہی ہے۔ یہ قاعدہ بڑے بڑے فطری اعمال مثلاً چلنا، پھرنا، کھانا پینا تک محدود نہیں ہے بلکہ تقریباً تمام قسم کے اعمال میں یہی قاعدہ جاری ہے۔ کیا خوب مثل ہے کہ

"عادت خود فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے":

اَخلاقیات کے دائرہ عمل میں نیکوکاری تک پہنچنے کی ایک آسان راہ، عمل کا تکرار ہے، عادت خود ضمیر کی آواز بن جاتی ہے، غیر متمدن آدمی کے لیے لاہوتی صفات رکھنے والا جانور، رواجی طور پر ممنوع عمل، یا ممنوع غذا، فطری طور پر نفرت انگیز ہو جاتی ہے۔ ایک مہذب شخص کے نزدیک جو اعلیٰ درجے کے مذہب کا پابند ہو، گناہ ایسی نامعقول اور بیہودہ حرکت ہوتی ہے کہ وہ ارتکاب گناہ سے پرہیز کرتا ہے۔

اِس جگہ ہم خود اِفادی قسم کا ایک عامل پاتے ہیں جو اچھے عمل کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے، اور زیادہ دلفریب اور زیادہ دلچسپ مگر بُرے عمل سے ہمیں روکتا ہے۔ یہ عامل ہمارے عمل کا خود ہماری ذات پر اثر ہے، ہر فعل کا چاہے وہ فعل سلبی ہو یا اِیجابی لازماً فاعل پر کوئی نہ کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔ برگسان کہتا ہے:

"یہ کہنا صحیح ہے کہ ہماری زندگی کا انحصار خود ہماری حقیقت نفس الامری پر ہے لیکن اِس میں اِتنا اِضافہ اور ضروری ہے کہ بڑی حد تک ہمارا اِنحصار ہمارے اعمال پر ہے۔ ہم ہمیشہ اپنے آپ کو جدید طور پر بناتے رہتے ہیں"

کسی بُرے فعل کی ایک بڑی سزا، خود فاعل پر اُس کے بُرے اثرات ہوتے ہیں۔ اور افلاطون کے قول کے بموجب تو کسی بُرے عمل کی بدترین سزا یہی ہے

کرنے اِنسانوں سے ایسے شخص کی مشابہت بڑھتی رہتی ہے"۔

عادتوں کی تخلیق میں ایک اِنسان اپنے ماحول سے شدّت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے، رواجی خیالات اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر کسی قوم میں یکسانی پیدا ہوتی ہے اور سماج کی مشین بغیر رکے ہوئے یکساں رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ ولیم جیمس کے قول کے مطابق، عادت سماجی مشین کا سب سے بڑا چکر ہے۔

ہماری ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

اچھے افعال کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا فوری فائدہ فاعل کو ملتا ہے ایسے افعال کے لیے متوقع فائدہ ہی سب سے بڑا محرک ہے، ایک شخص صرف اِسی محرک کی وجہ سے وہ فعل انجام دے گا، کسی دوسرے سبب و محرک کی ضرورت نہیں؛

دوسری قسم۔ وہ افعال واعمال ہیں جن سے کسی فوری فائدہ کی اُمید نہیں، مگر یہ خیال فاعل کے دماغ میں آسکتا یا لایا جا سکتا ہے کہ چند در چند واسطوں کے بعد آخر میں اِس فعل سے اُسے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ ایسے افعال بھی جذبۂ خود افادیت کے ماتحت کیے جا سکتے ہیں۔ چاہے متوقع فائدہ مادی ہو یا معنوی۔ سوسائٹی اپنے تمام متنوع و مختلف اثرات اچھے اعمال کی طرف ترغیب اور بُرے اعمال سے نفرت پیدا کرنے کی غرض سے اِستعمال کرے گی۔ رائے عامہ ایک پر اصرار اور دوسرے سے اِنکار کرکے اپنا اثر ڈالے گی —— اور اگر ضرورت داعی ہو تو مدنی و فوجداری قوانین کی مقرر کردہ سزائیں جنھیں محفوظ محرک کہا جا سکتا ہے اِستعمال میں لائی جائیں گی۔

ایک تیسری قسم اچھے اعمال کی وہ ہے جس کا کوئی شخصی فائدہ فوری یا بالآخر، براہ راست یا بالواسطہ کسی طرح فاعل کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ اُس کے برخلاف ان اعمال سے فاعل کو کسی قدر تکلیف اور نقصان ہی پہنچتا ہے، لیکن باوجود اس کے وہ اعمال ایسے ہیں جنھیں بجالانا ضروری ہے کیونکہ اِن اعمال سے اجتماع اور سماج کی فلاح ہوتی ہے۔

اِن اعمال کے لیے محرک کیا ہو، اور کیوں اِنسان ایسے افعال بجالائے۔ اگر مذہب اِنسان کو اس کا یقین نہ دلائے کہ آئندہ زندگی میں اُسے ایسے اعمال کا بہترین صلہ ملے گا، اور وہ شخص بہترین نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوگا تو پھر اس کے لیے محرک بڑی مشکل سے میسر آسکے گا —— اِس جگہ ایک اِنسان کا فرض ہے کہ شخصی فائدہ سے قطع نظر کرکے کام کرے، اور کارلائل کے قول کے بموجب یہ یقین رکھے کہ "نیکی خود اپنی جزاء ہے۔ اُس کے لیے کسی مزید جزاء کی ضرورت نہیں۔" اُسے جذبات محبت، رحم، وطن دوستی، اِحساس فرض یا اس قسم کے دوسرے جذبات کے ماتحت عمل کرنا چاہیے۔

اِس قسم کے محرکات خود انسان کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں، خود افادیت کی طرح ہمدردی اور ایثار کا جذبہ بھی اِنسان کا اندرونی جذبہ ہے سماج کا فریضہ ہے کہ جذبات ایثار کی نشو ونما کرے۔ اِبتدائی تربیت کے ذریعے اِس جذبہ کو مستحکم بنائے اور عادت سے مدد لے، اِس طرح بتدریج ایک ایسا سماجی نظام پیدا ہوجائے گا جس میں لوگ اچھا ہی عمل کریں گے اور خوش رہیں گے۔

دسواں باب

عائلی زندگی

عائلی زندگی

اس باب میں اور اس کے بعد والے ابواب میں، میرا ارادہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے چار اہم مسائل یعنی نظام عائلی، جائیداد، آزادی اور بین الاقوامی تعلقات پر اخلاق وعقائد کے مندرجہ بالا اصول کو منطبق کرنے کا ایک خاکہ پیش کردوں ——— انسان کی اجتماعی زندگی میں ان مسائل کو کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ خود ان مسائل کی قدامت سے ہو سکتا ہے جب سے بنی نوع انسان میں اجتماع کی پیدائش ہوئی غالباً اسی وقت سے یہ مسائل بھی پیدا ہو گئے۔ اور آج تک اس قدامت کے باوجود یہ مسائل جدید عصر میں نئے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بدلتے ہوئے زمانے میں خود ان مسائل نے بھی نئی نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔

دنیا کے ہر ملک میں اور ہر نظام اجتماعی میں دیکھیے، ہر گھرانہ عائلی حقوق وفرائض کے سوالات سے دوچار ہے — خاوند اپنی بیوی کے لیے اور بیوی اپنے خاوند کے لیے اپنے ذاتی و شخصی رجحانات کو کس حد تک قربان کر دے؟ دو انسانوں کا ایک شادی شدہ جوڑہ بچوں کی فلاح کے لیے اپنے رجحانات کو کہاں تک قربان کرے؟ عقد ازدواج ایک بے لوچ، مضبوط، اور نہ ٹوٹنے والا رابطہ قرار دیا جائے یا اس میں کسی قدر لوچ اور انقطاع کی صلاحیت ہونا ضروری ہے؟

اور ہونا ضروری ہے تو کس حد تک ہونا چاہیے؟ ہر جوان مرد و عورت کے سامنے عائلی و شخصی دو قسم کے فرایض ہیں۔ ہر جوان آدمی کے لیے یہ سوال درپیش ہے کہ شادی کرے یا نہیں؟ اور اگر شادی کرے تو کس سے کرے۔ اور کس عمر میں کرے چند مشرقی ممالک میں تو عقد نابالغان بھی اب تک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

یہ اور اس قسم کے سیکڑوں سوالات ہیں جن کا حل عصر جدید چاہتا ہے۔ آج تک ہوتا یہ رہا ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب رواج کے دفتر سے لیا جاتا تھا۔ پرانی روایات اور رائے عامہ کی پاسداری ملکی قوانین کے ذریعہ کی جاتی تھی اور یہی پرانی روایات اور رائے عامہ انفرادی اعمال کا فیصلہ کر دیتی تھی —— رواج کا یہ حال ہے کہ مذاہب کے اختلاف کے ساتھ رواج میں عظیم الشان اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح تہذیب کے معیار کا تفاوت بھی رواج میں اختلاف کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن اب تک رواج کے زمانہ اور ممالک کے ساتھ اختلاف کے باوجود رواج بہرحال موجود تھا، اور کافی قوت رکھتا تھا۔ عادتاً اس کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص رواج کی پابندی کو توڑ دیتا تو اس کے ہمسائیے اس پر نفرت کرتے تھے۔ اس کی بری شہرت قایم ہوتی تھی، بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ قانون اس کے خلاف حرکت کرتا اور عدالت اسے سزا دیتی تھی۔ اور خود وہ شخص بھی اپنے عمل کو نادرست سمجھتا تھا۔ عورتیں مردوں کی بہ نسبت رسم و رواج کی زیادہ پابند ہوتی تھیں لیکن آج رواج کی دنیا خود شک و ریب سے بھر چکی ہے آج یہ سوال درپیش ہے کہ جس خاص عمل کو ہمارے آبا و اجداد غلط سمجھتے تھے واقعتہً وہ غلط بھی ہے یا نہیں؟ پرانے رسم و رواج کی بنیاد کیا ہے، اور حقیقتہً کوئی بنیاد بھی ہے یا نہیں؟

مسئلہ ازدواج اور عائلی زندگی میں متعدد وجوہ و اسباب نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے شخصی آزادی پر اصرار نے ضابطہ بندیوں کو اکتا دینے والی شے بنا دیا۔ آزادی نسواں جو مغربی ممالک میں بہت زیادہ حد تک حاصل کی جا چکی ہے اور مشرقی ممالک کو بھی متاثر کر رہی ہے، اس سارے نظام کی تنظیم جدید کا مطالبہ کرتی ہے۔ مذہب کا اثر و نفوذ اور دوسرے معاملات کی طرح اس جگہ بھی کمزور پڑ گیا ہے۔" قانونی ازدواج (سول میرج) کا رواج بڑھ رہا ہے عیسائی دنیا میں طلاق کو قانونی درجہ دیا جا چکا ہے۔ اور اب عقد ازدواج کو مقدس پیمان کی بجائے صرف ایک باہمی معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔ عام ذہنیت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے مسلمات کو فضول، بے کار اور غیر ضروری قرار دیا جائے، بہت سی ایسی باتیں جنھیں اس وقت پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ آج پوری طرح نمایاں ہیں۔ مانع حمل تدابیر کی ایجاد اور تنوع کن عواقب و نتایج کا حامل ہے، وہ آج اس کے ابتدائی دور میں بھی ہمیں اچھی طرح نظر آ رہے ہیں۔

جیسے جیسے تہذیب آگے بڑھتی جا رہی ہے وہ حالات جنھوں نے پہلے زمانہ میں عائلی زندگی کو سلوح کے لیے لازمی محافظ بنا رکھا تھا، اپنا زور اور اپنی قوت کھو رہے ہیں —— ایک زمانہ تھا کہ پولس اور عدالت نہ تھی، جرایم اور برائیوں سے بچانے والی ایک ہی کامیاب ہستی ہوتی تھی اور وہ ہستی عائلی زندگی میں مورث اعلی یا سردار عائلہ کی ہوتی تھی، سردار عائلہ اپنے افراد خاندان کو دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا تھا، اور دوسروں کے ظلم و تعدی سے ان کو محفوظ رکھتا تھا۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آجاتا تو خود اس کی مناسب سزا متعین کرتا اور اسے نافذ کر دیتا تھا —— اکثر اوقات اس زمانہ میں وظیفہ پیرانہ سالی، اور قانون غربا وغیرہ کے ہونیکی

وجہ سے آدمی کے لیے عائلہ وقبیلہ کے علاوہ کوئی دوسرا ملجا، وماویٰ بھی نہ ہوتا تھا ——— مگر آج کل جدید زمانہ میں حالات ایسے بدل گئے ہیں کہ یہ چیزیں تقریباً ختم ہوگئیں — ایک بات اور بھی اس زمانہ میں تھی جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس زمانہ میں ماں باپ، بال بچے عام طور پر ایک ہی جگہ زندگی بسر کرتے تھے، اور اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں ضروریات وحالات نے اس صورت حال کو اکثر جگہ ختم کر دیا ہے، تعلیمی، معاشی اور تربیتی ضروریات ایک ہی گھرانے کے افراد کو اکثر مختلف مقامات پر بکھیر دیتی ہیں، اور عائلی زندگی کے روابط قایم نہیں رہتے۔ ناول اور ڈرامے وہ طوفان ہیں جن کی قوتوں نے تمام نیک تصورات کی سربفلک عمارتوں کو منعدم کر دیا ہے۔ ایک معاصر مصنف لکھتا ہے کہ:۔

> "نیکی اور احترام جو اب تک ایک زمانہ سے قابل تعریف اُمور سمجھے جاتے تھے، اب تقویم پارینہ ہوگئے ہیں، بلکہ مفادات قابل جزا، نیکی سے غیر متعلق ہوکر بے سزا بدی سے متعلق ہوگئے ہیں . . . . . ادب پر احتساب باقی نہیں رہا اس لیے ہمارا خزانۂ ادب آزاد ہے کہ ہر بری بھلی چیز کو اپنے ہاں جگہ دیدے ایک بہت بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو حدود ادب سے عادتاً تجاوز کرتا ہے اور دوسرے اس لیے اسے برداشت کرلیتے ہیں کہ ان کے دماغوں میں اس کے آرٹ اور فن لطیف ہونے کا تصور پیدا کر دیا گیا ہے۔"

یہ گھریلو مسائل جو روز آنہ تقریباً ہر گھر میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اکثر اوقات ایسے زبردست طوفان بن جاتے ہیں جس کی لپیٹ میں نہ صرف ایک بلکہ متعدد انسانی

زندگیاں آجاتی ہیں۔ اب اس جگہ پھر اصول کا سوال پیدا ہوتا ہے، اور یہ سوال سامنے آتا ہے کہ نظام عائلی کو مفید اور اہم ادارہ کا مقام دیا جائے یا نہیں؟ اگر اس کو اہم سمجھتے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے، اور اگر اہمیت نہیں دیتے تو ہمارا عمل کیا ہونا چاہیئے۔ تاریخ کے اوراق کو الٹیے اور واقعات وحوادث کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کی نسلی خصوصیات اور خاندانی روایات نے ان کے اجتماعی اخلاق کی تعمیر میں ناقابل انکار موثرات کا کام کیا ہے، بلکہ بسا اوقات ان خصوصیات نے قسمتیں بدلکر رکھ دی ہیں۔ روما کی قوت وشکوہ کا پرچم ان کے عائلی نظام پر قایم تھا، اسی طرح چین کی عظمت اور جاپان کی جفاکشی وکارکردگی عائلی نظام کی مرہون منت تھی۔ انگلستان کا اتفاق نسلی، کون کہہ سکتا ہے کہ اسکی کامیابیوں میں موثر نہیں ہے؟ یہودیوں کی تاریخی عظمت ساری کی ساری نسلی روابط سے وابستہ ہے۔

ابتدائی رومن عہد کے سردار، اور نوابین کے ہاں خاندانی بزرگوں کی پوجا ہوتی تھی؛ سالگرہ پر قربانیاں کی جاتی تھیں، اور یقین کیا جاتا تھا کہ مرنے کے بعد انسانی زندگی وارثوں کے افکار واعمال کے بموجب باعزت یا بے عزت قرار پاتی ہے، ان لوگوں کا یہ اعتقاد کہ وارثوں کی برائی مورثوں کے لیے دوسری دنیا میں ذلت ورسوائی کا باعث ہوتی ہے، فرایض وحقوق کی طرف متوجہ رکھنے والی ایک دوامی قوت تھی۔ اس طرح ہر شخص یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اس کے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اس کی کامیابیوں سے فخر ومسرت، ناکامیوں سے رنج وغم اور اس کی ذلت سے شرم وغیرت محسوس کرنے والے کچھ لوگ (آباء واجداد)

موجود ہیں — آپ جانتے ہیں کہ جس شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کے اعمال وافعال سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کے لیے دل بڑھانے والی اور اُبھارنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ۔

اخلاقی بنیادوں پر بحث کرتے ہوئے ہم کہہ چکے ہیں کہ رائے عامہ اچھے اعمال کی طرف رغبت دلانے والی ایک قوی محرک ہے۔ اپنے گھرانے کی رائے بھی رائے عامہ کی ایک جزء ہے یہ اگرچہ وسعت میں کم ہوتی ہے مگر قریب کے موثر ہونے کی وجہ سے اس کا اثر تیز، گہرا اور پائیدار ہوتا ہے ۔ ایک شخص دوستوں میں بدنام ہو کر اور قوم میں رُسوا ہو کر اپنے کنبہ و گھرانہ میں منہ چھپا سکتا ہے لیکن اپنے گھر میں رسوا کر دوستوں میں نیک نام بن جانا آسان کام نہیں ہے ۔ اجتماعی اخلاقیات میں خاندانی اعزاز و سربلندی بڑی اہم چیز ہے ۔

اگر کسی انسان کو سماج کے لیے مفید بننا ہے تو اس کے لیے عائلی زندگی کی اشد ضرورت ہے، نہ صرف جوانی میں بلکہ بچپن سے لے کر بوڑھاپے تک ہر وقت ضرورت ہے ۔کسی بچہ کی صحیح نشو ونما کے لیئے، اس سے محبت کرنے والا اور حقیقی ربط رکھنے والا گھر ہی صرف وہ ماحول ہے جسے اس کی فطرت کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ کوئی ریاض اطفال اور کوئی پرورش گاہ اس کی افادیت کے پاسنگ کو نہیں پہنچ سکتی ۔ مسرت سے لبریز طفولیت بجز عائلی نظام کے اور کہیں نہیں پائی جا سکتی — علم نفسیات کی جدید ترین تحقیقات نے ان اثرات کو واضح طور پر پیش کر دیا ہے جو ایک جوان میں اس کے بچپن کے ماحول کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں — کسی جوان عورت یا مرد کے لیے عائلی زندگی کا مقام دنیا کے اس وسیع و عریض سمندر میں اس محفوظ

ساحل کا مقام ہے جہاں سے وہ تیرنے کے لیے جاتا ہے جہاں آکر آرام کرتا ہے اور اگر سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہوں تو اس پر واپس آکر اطمینان کا سانس لیتا ہے ـــــ ان تصورات کو چھوڑ دیئے کہ سماج اور قومی نظام آڑے وقت پر آپ کی کیا امداد کر سکتا ہے بہت کچھ سہی، لیکن اس کے بعد بھی ہمدردی کرنے والے اقربا، اور حقیقی ربط رکھنے والے اعزہ سے آپ بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

کیا آپ کے تصور میں کوئی ایسا فرد بھی آتا ہے جو اپنی بساط کے مُطابق زندگی کو بہتر بنانے کی سعی میں نہ لگا ہو یہ مساعی، دماغی، ذہنی، معاشی، مذہبی وغیرہ میں سے کسی قسم کی ہو سکتی ہیں مگر کسی ایسی زندگی کو مکمل زندگی نہیں کہا جا سکتا جو کسی قسم کی مساعی میں شریک نہ ہو۔ ایک گھر، اور پھر ساری دنیا، یہ دو چھوٹے بڑے ماحول انسانی زندگی کے بہترین ماحول ہیں۔ دنیا سے چھوٹی ہوئی اور گھر سے بے خبر اکیلی اور تنہا زندگی انتہائی کمتر درجہ کی ناکارہ اور پست زندگی ہے ـــ اسی طرح چھوٹے ماحول سے بے نیاز ہو کر وسیع ماحول میں کوئی انسان کارآمد نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو کہ عائلی زندگی کے بغیر بین الاقوامی زندگی کا تصور دیوانے کا خواب ہے۔ عائلی زندگی کی بنیاد نکاح کے استوار اور باضابطہ نظام پر قائم ہے۔

اس جگہ بھی خود افادیت اور ایثار کے مابین توازن کا سوال اہم ترین سوال ہے، آپ جانتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان توازن ہی اصل میں زندگی کا حق ہے جس کے بغیر زندگی خوش گوار، مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتی ـــ اوپر کی بحث کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جدید عصر کی مسموم ذہنیت جس قدر گنجائش پابندی اور ایثار کے لیے مہیا کرتی ہے ضرورت ہے کہ اس سے زیادہ پابندی اور ایثار پر زور دیا جائے۔ خود افادیت اپنی جگہ پر مفید چیز ہے

اس سے انکار نہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی تحریک خود افادیت کو اس قدر بڑھ جانے کا موقع نہیں ملنا چاہیئے کہ عائلی نظام کی بنیادوں کو اکھیڑ پھینک دے یا کم از کم متزلزل کر دے۔

یہ ذہنیت صرف اس لیے کہ اسے جدت اور روشن خیالی سمجھا جاتا ہے بہتر نہیں سمجھی جا سکتی، اگر قدیم کا صرف قدیم ہونے کی بنا پر مبنی بر صداقت ہونا ضروری نہیں تو جدید کا صرف جدید ہونے کی بنا پر معقول ہونا کہاں ضروری ہے؟ ۔ اگر تمام پرانی چیزوں کو بغیر چھان بین کے صرف اس بنیاد پر ٹھکرا دیا گیا کہ ان کی حیثیت "قدیم عادات" سے زیادہ کچھ نہیں ہے تو موجودہ آزادی میں انسان کے لیے نقصان کا پلہ فلاح کے پلہ سے ہزار درجہ زیادہ وزنی ہو جائے گا۔

یہ ضروری نہیں کہ قدیم رواج صرف اس لیے مہمل قرار پائیں کہ ان کی ابتدا کسی وہم یا دور از عقل خیال پر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض رواج ابتداءً غلط تخیل یا وہم پر قائم ہوئے ہوں۔ ان کی بنیاد میں علم الاصنام، سحر، عجائب پرستی وغیرہ رہی ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ افادیت کے نقطہ نظر سے وہ آج مفید نہ قرار پائیں ـــــ آج جو ہم ہفتہ وار تعطیل کرتے ہیں تو اس عقیدہ کے ماتحت نہیں کرتے کہ خالق کائنات نے چھ دن میں کائنات کو پیدا کیا اور ساتویں دن تھک کر آرام کرنے بیٹھ گیا اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے بندے بھی اسی طرح ساتویں روز آرام کریں۔ بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا مفید ہے، قوتِ کارکردگی بڑھتی ہے اور دوسرے بہت سے فائدے ہیں ـــــ نظام عائلی اور نکاح وغیرہ کی روایات اور استناد۔ ان کی ابتداء اور ان کے رواج سے زیادہ ان کی افادیت، ان کے

معدوم ہونے سے نقصانات۔ اور عقل و فراست کی کسوٹی پر ان کا کھرا نکلنا اس کا مقتضی ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔

طلاق کے لیے مناسب گنجائش پیدا کرنا مختلف ممالک میں زیر بحث ہے ___ سماج اور اجتماع نوع انسانی کا اوّلین اور اہم ترین مسئلہ رشتۂ ازدواج کا استحکام ہے۔ استثنائی صورتوں میں جب کہ نباہ بالکل ناممکن ہو رابطۂ ازدواج سے گلو خلاصی اگر ضروری ہے تو اس رابطہ کا مستحکم، مضبوط اور جلد نہ ٹوٹنے والا ہونا، اُس سے زیادہ ضروری ہے ___ اگر رابطۂ ازدواج آسانی کے ساتھ توڑا جا سکے گا تو یاد رکھیئے کہ اس سے آسانی کے ساتھ جوڑا بھی جا سکے گا ___ اور عائلی نظام تارِ عنکبوت کی طرح کمزور ہو جائے گا۔ اس کا اثر بچوں پر پڑے گا، اور انھیں مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔

برتھ کنٹرول کے استعمال نے نہایت مشکل سوالات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ سوالات سماجی بھی ہیں اور شخصی بھی، کسی ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کس قدر ہو یہ ایک سوال ہے جس پر معاشیات اور سیاسیات کے ماہرین غور فرما رہے ہیں ___ بچوں کی شرح اموات کو کم کرنے کی مساعی کی بجائے پچھلے چند سال کے اندر اکثر مغربی ممالک میں برتھ کنٹرول کا استعمال شرح پیدائش کو نصف کی حد تک کم کر چکا ہے، اگر یہ خیال درست ہے کہ ایسا ہونا چاہیئے تو پھر ایک خوش حال گھرانے کے لیے سماجی نقطۂ نظر سے اہم ترین سوالات پیدا ہو جاتے ہیں ___

برتھ کنٹرول کے طریقے جس قدر اب تک ترقی کر چکے ہیں، وہ مانع حمل تدابیر، اور مانع حمل ادویہ کی صورت رکھتے ہیں، یہ خطرناک ہیں۔ بدن انسانی کے لیے، اور عصمت کی بنیادوں کے لیے بھی۔ یہ ایک تجربہ ہے کہ مانع حمل

تدابیر نے عصمت کو سخت نقصان پہنچایا ہے ـــــ اباحیت تاریخ میں اخلاق اور نسل انسانی کی تباہی و بربادی تک پہنچانے والی ایک یقینی شاہ راہ ثابت ہو چکی ہے۔ اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ اسی منزل بلاکت پہنچانے والی شاہ راہ ثابت ہو گی ـــــ اگر زمانہ کے جدید حالات جنسی آزادی کو غیر معتدل منزل تک پہنچا رہے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ تہذیب و اخلاق کا معیار بھی پست ہو جائے۔

آج کل علم الجنین، اور علم توریث خصائص پر بڑی تحقیقات ہو رہی ہے، مینڈل کے مقرر کردہ اصول توریث اخلاق و خصائص نے بہتر نسل انسانی سے متعلق گراں قدر اکتشافات کیے ہیں، بقول سر ہیبرٹ جامرسن تکمیل مسئلہ توریث خصائص اور بہتر نسل کی پیدائش کا مسئلہ آج تجربی علوم کی جان بن گیا ہے۔ سب سے زیادہ مفتخر و مکرم حیوان یعنی انسان کے لیے اگر ان علوم سے کام لیا جائے تو اصلاح نسل انسانی کا ہمارے لیے ایک بہتر موقع مہیا ہوتا ہے۔

چونکہ نسل انسانی کی ترقی اور انسان کی طبعی قوتوں کو نسل بہ نسل ترقی دینے کے ذرایع معلوم کیے جا رہے ہیں، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان ذرایع کو اختیار کر کے بنی نوع انسان کی خدمت انجام دیں۔ اچھی بہو اور اچھے بر کی تلاش ایک قدیم طریقہ ہے۔ طبعی و دماغی توافق اس معاملہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ـــــ اگر جعلی سکہ کا بازار میں چلانا اخلاقی و قانونی جرم ہے تو غیر مناسب اور نسلی حیثیت سے ناکارہ افراد پیدا کرنے کی کوشش اس سے کہیں عظیم تر جرم قرار پاتی ہے۔

عائلی زندگی کے مسئلہ میں عام طور پر دو قسم کے خیالات رکھنے والے گروہ

پائے جاتے ہیں۔

اوّل:۔ پہلے گروہ کو آزادیٔ عمل، خود پسندی اور لطف اندوزی پر اصرار ہے، اس کے نزدیک جنسی تعلقات ایک قسم کے معمولی اور نازک تعلقات ہیں شادی ایک قسم کا تجربہ ہے، تفریق یا طلاق زندگی کے معمولی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے، اُس کی نظر میں بے اولاد ہونا بہتر ہے، یہ لوگ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو اولاد تک برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اولاد کی طرف سے عائد شدہ حقوق و فرایض کو وہ اپنی زندگی میں ثانوی درجہ دیتے ہیں۔

دوم:۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو دوامی محبت کا قائل ہے جس کو اُلفت کے استحکام، خانوادہ کے نظم، بچّوں کی تربیت اور اجتماعی زندگی میں عائلی نظام کی اہمیت پر اصرار ہے۔ جس کے نزدیک رشتۂ ازدواج کا دوام حقیقی اور عادتی مسئلہ ہے، اور طلاق تفریق ایک تباہ کن اور باعث ننگ و عار واقعہ ہے وہ اپنی ازدواجی زندگی میں توافق و تطابق اس لیے پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کی رائے میں ایسا ہونا ضروری ہے۔ وہ اپنے بچّوں کو میاں بیوی کے مابین تفریق و طلاق کی وجہ سے بے خانمان کر دینا پسند نہیں کرتے، وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح بچے بہت کچھ کھو بیٹھیں گے۔

اِن دو گروہوں کے مابین بہت سے مدارج قائم کیے جا سکتے ہیں اور کیئے جاتے ہیں لیکن حقیقتہً یہی دو قسم کے خیالات ہیں جن کے مابین دنیا کو تصفیہ کر کے کسی ایک خیال کو قبول کرنا ہے ـــ پہلا خیال، اس کی تائید میں جذبات ہیں چند "روشن خیال" نوجوان ہیں، اور آرٹ اور ادب لطیف کا ایک

انبار ہے لیکن یقیناً ان دونوں کے مابین کش مکش کا نتیجہ دوسرے خیال کی فتح اور پہلے خیال کی شکست نکلے گا اس کے تین ناقابل انکار وجوہ ہیں۔

اوّل :- دوسرے قسم کے خیالات رکھنے والے اپنی زندگی کو گروہ اول کی زندگی سے زیادہ پرسکون اور زیادہ با اطمینان پاتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہے کہ زندگی کا یہ طریقہ بہتر ہے، اس لیے دنیا مجبور ہے کہ اس تجربہ سے فائدہ اُٹھائے۔

دوم :- دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی اجتماع میں خانوادہ ایک مفید ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے، جب کبھی اس ادارہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی سماج اپنی تمام طاقتوں سے اس کا مقابلہ کرے گا، انفرادی جذبات اور شخصی بے راہ روی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

سوم :- تیسری اور بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ گروہ اول نسلی اولاد یا تو رکھتا ہی نہیں یا رکھتا ہے تو بہت تھوڑی تعداد میں، اس لیے اس قسم کے خیالات ایک نسل میں پیدا ہو کر دوسری نسل تک متوارث نہیں ہوسکتے بلکہ گروہ دوم اسے آسانی کے ساتھ ختم کر دے سکتا ہے اور ختم کردیگا۔

گیارھواں باب

افلاس و تونگری

افلاس و تونگری

موجودہ تہذیب کے لیے جو خطرات درپیش ہیں ان میں سب سے زیادہ تباہ کن خطرہ افلاس کا خطرہ ہے۔ افلاس حیات انسانی کو مقید طبعی قوتوں کو پست اور مسرتوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے یہ افلاس ہی ہے جو بے چینی اور بدمزگی پیدا کرتا ہے ــــ افلاس کے خلاف جدوجہد اور اس سے فریاد بہت وسیع پیمانہ پر سماجی بے چینی اور ہلچل پیدا کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا دور بے سکون اور ہماری تہذیب و شایستگی بے استحکام ہو گئی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ صدی سے یورپ افلاس کے دلدل سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ یہ جدوجہد کبھی موقتی، کبھی مسلسل، کبھی ہنگاموں کے ساتھ اور پرسکون طریقہ پر ہوتی ہے جس میں کبھی آگ کی سوزش ہوتی ہے اور کبھی ایثار و قربانی کی طراوٹ۔ انقلاب فرانس کا حقیقی سبب سیاسی نہیں بلکہ سماجی و معاشی بے چینی تھی، اس وقت سے اب تک سارے یورپ میں کارخانوں کے عمال کسان اور کھیت مزدور اس صورت حال سے نکلنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جو ان کے مقام کو پست اور تکلیف دہ بنائے ہوئے ہے، یہ صورت حال کچھ تو یاد ہے قدیم ازمنہ وسطی کی اور کچھ مرہون منت ہے جدید صنعتی انقلابات کی۔ مشینوں کی ایجاد ہزاروں مزدوروں کو یکجائی طور پر کارخانوں میں لگانا

بے تکان تجارتی مقابلہ، اور تجارتی تسخیر کی کوششیں بے شمار آفتوں کا سبب بن گئی ہیں۔ البتہ امریکہ آج تک ان آفتوں میں سے جو پرانی دنیا پر مسلط ہیں، اکثر سے محفوظ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نسبتہً کم آبادی بہت زیادہ قدرتی ذرایع دولت سے بہرہ اندوز ہے، محنت اور توانائی روایات کی بندش اور بڑی حد تک قانون کی پابندیوں سے اب تک مامون ہے ـــــ امریکہ کی اس بے شمار دولت کے مقابلہ میں ایشیا کے گنجان حصّوں کو دیکھئے وہاں افلاس و فاقہ کشی اس شدت کے ساتھ موجود ہے کہ امریکہ تو کیا یورپ کے برے سے برے حصہ میں بھی اتنی شدت کے ساتھ موجود نہیں۔

ڈیڑھ صدی کی متواتر کوششوں سے تقریباً ہر جگہ ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگر ساری دنیا کو بحیثیت مجموعی دیکھئے تو یقیناً انسانی زندگی کا مادی معیار آج کل تاریخ کے ہر دور سے بلند ہے، لیکن مجموعی طور پر جو صورت حال معلوم ہوتی ہے وہ حقیقتہً ایک بڑی غلط فہمی کا باعث ہے ـــــ ذرا غور سے دیکھئے کروڑوں مخلوقِ خدا افلاس و فاقہ کشی میں مبتلا ہے جن کے لیے ذرایع آمدنی بالکل مسدود ہیں، جن کو قوت لایموت بھی میسّر نہیں ہے۔ مارشال لکھتا ہے کہ امید آزادی، اور متنوع قوت کارکردگی کے لیے بھی ضروری ہے اور مسرت کے لیے بھی، لیکن کروڑوں اشخاص کو افلاس اور تنگدستی نے ان امور سے محروم کر دیا ہے۔

اتنی طویل و عریض مدت کی کوششیں اپنے مقصد تک پہنچنے میں تو صرف ایک جزر کی حد تک کامیاب ہوئیں لیکن ایک بات یہ البتہ ہوئی کہ عام طور سے مقصد کی خوبی سے اتفاق کر لیا گیا۔ مہذب دنیا میں اصحاب فکر کی بہت بڑی اکثریت اس پر متفق ہے کہ موجودہ معاشی صورت حال کی اصلاح توجہ

اور استقلال کے ساتھ ہونی چاہیئے ۔ عام طور سے لوگ اس مقصد کو شخصی و اجتماعی اعمال میں مقررہ نصب العین کا درجہ دینے کے لیے تیار ہیں ۔ جمہوری ممالک میں ہر سیاسی پارٹی اپنے مقاصد میں اس مقصد کو ضرور رکھتی ہے اور آمریت بھی اس مقصد کے حصول کی مدعی ہے ۔ روس میں تو مملکت کا بنیادی اصول ہی اس مقصد کا حصول قرار دیا گیا ہے ۔ ہندوستان میں ایسی تحریکوں کی ابتدا ہو چکی ہے ۔ چین میں بھی ایسی حرکت پیدا ہو رہی ہے ۔

پچھلی صدی میں اس مقصد سے اس قدر عام اتفاق موجود نہ تھا، بلکہ انفرادیت پسندوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ۔ صنعتی مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے یہ تو خیال کیا جاتا تھا کہ بہر حال اصلاح ہونی چاہیئے لیکن یقین یہ کہا جاتا تھا کہ حالات خود بخود بدلتے رہیں گے، معاملات عمال میں دخل نہ دینا ہی بہتر سمجھا جاتا تھا ۔ فن اقتصاد سیاسی نے اپنے ابتدائی دور میں اقتصادی انسان، حوصلہ مندی، محنت اور سرمایہ و اسباب کے غلط نظریوں میں پڑ کر حکومت کی طرف سے "عدم مداخلت" کی تبلیغ کی ۔ بعد کو جب ان نظریوں پر عمل کیا گیا تو تجربہ نے ان کے تباہ کن ہونے کا فیصلہ کر دیا ۔ پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتے ہیں کہ آج کسی کو یہ یقین نہیں ہے کہ راہ راست کی طرف رہنمائی کرنے والی کسی طاقت کے بغیر انفرادی سابقتوں اور شخصی حقوق کی حفاظت کے ذریعہ کوئی قابل اطمینان سوسائٹی وجود میں آسکتی ہے ۔ مسٹر کینس کہتے ہیں کہ کارینس نے ۱۸۷۰ء ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ :۔

"عدم مداخلت کے انتہائی حدود کی کوئی علمی بنیاد نہیں بلکہ یہ عمل کے لیے ایک معمولی ضابطہ ہے اور بس"

مسٹر کینس اس کے بعد کہتے ہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے تک تمام سربرآوردہ اقتصادیین کا یہی نظریہ تھا۔ لیکن اب آج کل کچھ اشخاص یہ خیال رکھتے ہیں کہ آزادی کی تجدید قانون کے ذریعہ ہونی چاہیئے۔ اور بہت سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ غور و خوص کے بعد بنایا ہوا قانون نہ صرف آزادی کو وسیع تر بنا سکتا ہے بلکہ اس کی مدافعت کا فرض بھی انجام دے سکتا ہے۔ اور کم از کم اس پر تو سب ہی کا اتفاق ہے کہ آزادی کی کوئی ایسی مقرر مقدار نہیں جو لازمی طور پر اجتماعی اختیارات کی ترقی کے ساتھ ساتھ گھٹتی جائے گی۔

ہاں اب بھی اس مسلہ کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے، جیسے ڈاکٹر کارل کا بیان ـــــ کتاب "مَین دِی اَنْ نُون" (مرد ناشناسا) میں ڈاکٹر صاحب موصوف اعلان فرماتے ہیں کہ ہمارے تمام انسانی قوانین کا بنیادی تصور ہی غلط ہے، اس میں کمزوروں اور ناکاروں کو زندہ رکھنے کی سعی کی گئی ہے حالانکہ نسل انسانی کا فائدہ اسی میں ہے کہ ان کو مرنے دیا جائے" ایسی آوازیں محض چند ہیں ـــــ ہر صاحب نظر پر روشن ہے کہ جو حالات ناکاروں کو ختم کرتے ہیں وہی حالات دوسرے ناکارے پیدا بھی کر دیتے ہیں۔

کمزوروں کو ختم کر دینے کی بجائے ماحول کو درست کیجئے بچوں کی صحیح نگہداشت، بروقت طبی امداد وغیرہ کا انتظام فرمایئے۔ اور یقیناً ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ بے شک کچھ کمزور و ناقص بچے بار انسانیت ہیں، لیکن ہم اپنی کوششوں کے ذریعہ اس سے بہت بڑی تعداد کو بار انسانیت بن جانے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں علیٰ ہذا القیاس دوسرے امور میں بھی ہماری حفظ ماتقدم تدابیر اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں کسی خاص طریقہ کو فطری اور کسی کو مصنوعی قرار دینا محض

سخن سازی ہے۔ پہاڑی، دریا، زمین، آب و ہوا تو فطری و قدرتی ہیں لیکن کسی سماجی ماحول کسی قانون کے وجود، یا قانون کی عدم موجودگی کو کسی معنی میں فطری و قدرتی امر نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ سب چیزیں انسانی اعمال، افکار اور انسانی فیصلوں کی پیداوار ہیں۔ اس لیے ان امور کو مصنوعی حالت سے تعبیر کیا جائے گا۔ کوئی صنعتی و تجارتی طریقہ فطری طریقہ نہیں ہو سکتا، قانونی ضوابط سے اُسے آزاد رکھنا یا جماعتی سوداگری کا اس میں دخل نہ ہونا، اس طریقہ کو فطری و قدرتی نہیں قرار دے سکتا ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ اوسط درجہ کے انسانوں کے لیے مادی امور روحانی امور کی بنیادیں ہیں، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ زندگی صرف کھانے پینے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ بھی کچھ ہے، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی کی ابتدائی ضرورتیں حسن وعشق، محبت و نفرت، علم و فلسفہ سے اول درجہ ہی پر رکھی جائیں گی۔ ان ضرورتوں کو کمتر تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن غیر حقیقی کیوں کر قرار دیا جائے گا۔ کسی مفلس کو یہ سمجھانا کہ وہ اپنے افلاس پر اس لیے صابر و شاکر رہے کہ علم، سکون اور روحانی مسرت امارت کی بجائے غربت ہی میں پائی جاتی ہے، کچھ زیادہ کارآمد نہیں، اور نہ آج اس نصیحت پر کوئی کان دھرتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ معاشی حقایق ہر شخص کے با اطمینان زندگی بسر کرنے کو ناممکن قرار دیتے ہیں، لیکن آج کوئی شخص اس استدلال کو سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ایک نسل پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ ساری دنیا کی دولت اگر تمام آبادی پر مساوات کے ساتھ تقسیم کر دی جائے پھر بھی غریب غریب ہی رہے گا۔ البتہ امیر غریب ہو جائیں گے مگر غریب امیر نہیں ہو سکیگا

امیر بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اور غریب بہت زیادہ اس لیے اس تھوڑی تعداد کی دولت تقسیم ہو کر بھی اتنی بڑی تعداد کو امیر نہیں بنا سکتی ——
اس زمانہ میں اس استدلال سے تشفی ہو جاتی تھی لیکن آج یہ سوال ہی بدل گیا، آج محدود مقدار دولت کی دوبارہ تقسیم کا سوال ہی نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں دولت پیدا کی جائے اور زیادہ سے زیادہ آدمی اس سے بہرہ اندوز ہوں، زراعت، صنعت، اور تجارت میں مختلف علوم و فنون نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مقدار دولت کی کمی کو بطور دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا، کیمیا، مشین سازی، نباتیات اور حیاتیات کی امداد سے ذرایع دولت کو زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔

اکثر حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں مشین نے اس طرح ہمارے زندگی کے متعلقہ شعبوں پر قبضہ حاصل کر لیا ہے کہ خود انسان حقیقۃً مشینوں کا غلام بن گیا ہے۔ اب بغیر مشین کے کچھ نہیں ہو سکتا ہے، کھانے کی اشیاء کی تیاری ہو یا پہننے کے لیے کپڑوں کی تیاری، مشین ہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور مشین نہیں تو کچھ بھی نہیں، اس طرح ہماری زندگیاں مشین کی غلام ہو کر رہ گئی ہیں ——
لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کہنا شتاب کاری ہے واقعۃً ہم مشینوں کے غلام نہیں ہیں بلکہ اس کے برخلاف خود مشینیں ہماری غلام ہیں۔ اگلے زمانہ میں غلامی کا طریقہ رائج تھا اور غلام کام کاج کیا کرتے تھے، آج ان غلاموں کی جگہ مشینیں ہیں۔ اور سارے کام کاج مشینوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں ——
یہ صحیح ہے کہ اگر عمل میں نظم قایم نہ رہے تو انسانی اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں جس سے پرہیز لازم ہے، لیکن اس کی وجہ سے مشینوں کو مضر یا بے کار نہیں قرار دیا جا سکتا — مشینیں، فن کیمیا، اور فن حیاتیات نے باہمی تعاون سے

دنیا کی اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ضروریات کی بڑی اور متنوع مقدار مہیا کر دی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہماری محنت کو اس حد تک آسان کر دیا ہے کہ اگلے لوگ اپنے خوش آئند خوابوں میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ غرض کہ افلاس کے وجود کو لازمی قرار دینے کی یہ دلیل کہ دنیا کی دولت دنیا والوں کے لیے کافی نہیں ہے، اس زمانہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

ہماری سماجی بے چینی کا ایک اور سبب بھی ہے۔ موجودہ سماجی بے چینی کا سبب صرف عمال کی جدوجہد اور مادی محرومیوں سے محفوظ رہنے کی مساعی نہیں ہیں بلکہ اس کا ایک غیر مادی سبب بھی ہے اور وہ سبب سماج کی غیر معدلت پروری ہے۔ اگر دنیا کے سارے مزدوروں کو ہر ملک میں یقین دلا دیا جائے کہ ان کی محرومیاں اب باقی نہیں رہیں گی، اور حقیقتہً محرومیاں ختم کر کے انھیں ہر طرح کے حقوق اور فراغ بالی عطا بھی کر دی جائے پھر بھی بے چینی اور الجھاؤ باقی رہ جائے گا ــــــ ہمارے معاشی نظام میں آمدنیاں اس قدر غیر مساوی ہیں کہ اخلاقی نظام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک چابک دست کاری گر ایک طویل مدت تک کام سیکھنے کے بعد تمام دن مسلسل کام کر کے صرف اتنی رقم حاصل کرتا ہے جتنا دوسرے دولت مند اشخاص اس سے کم اور بعض مرتبہ بغیر محنت کے حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ ایک اچھے کاری گر کی سال بھر کی محنت کا پھل اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا ایک ہفتہ یا ایک دن میں کسی امیر آدمی کی آمدنی ہوتی ہے ــــ یہ تو صحیح ہے کہ ذہین افراد سماج اور اجتماع کی خدمت انجام دیتے ہیں لیکن ان کو اس خدمت کا جو صلہ ملتا ہے وہ تناسب سے زیادہ ہو جاتا ہے ــــــ اسی طرح ایک امیر باپ سے اس کی اولاد کو دولت کی بڑی مقدار منتقل ہو جاتی ہے حالانکہ

اولاد کی محنت کو اس دولت کی بہم آوری میں کوئی دخل نہیں ہوتا ـــــ اس کے بعد یہ دولت نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہے ـ اکثر یہ متوارث دولت بغیر کسی محنت کے بڑھتی بھی رہتی ہے اور کوئی طاقت نہیں جو اسے بڑھنے سے روک سکے ـ سرمایہ دارانہ فراست صنعت، کارکردگی، اور چابک دستی کے نتائج سے اکثر مقامات پر بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے ـــــ جدید تہذیب کا معاشی رُخ ناانصافیوں اور عدم مساوات سے اتنا گھناؤنا ہو گیا ہے کہ لازماً نفرت پیدا ہوتی ہے ـ ایک کارخانہ میں کام کرنے والا مزدور جب اپنی زندگی، اپنے کام اور اپنی آمدنی پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے مذکورہ بالا عدم مساوات کے علاوہ اس امر کا بھی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر توانائیوں اور صلاحیتوں کو کسی دوسرے شخص کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کر رہا ہے اور اس کی زندگی صرف غیر کے لیے نفع اندوزی میں بسر ہو رہی ہے ـ

کیا اب بھی یہ امر تعجب خیز ہے کہ موجودہ عہد، بے چینی، بے اطمینانی اور بے اعتباری کا عہد ہے ؟ حق تو یہ ہے کہ اگر یہ زمانہ ایسا نہ ہوتا تو تعجب خیز بات ہوتی ـ

یہاں تک تو سب مانتے ہیں کہ افلاس ایک مصیبت ہے اس کا علاج ہونا چاہیئے، اور ایسا موثر علاج ہونا چاہیئے کہ اس مصیبت سے نجات مل جائے ـ لیکن علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں جن مسائل سے واسطہ پڑتا ہے وہ ملکیت جائداد اور تقسیم دولت کے مسائل ہیں ـ یہاں اختلافات کا ایک طوفان بپا ہے، جائداد کی ملکیت اور دولت کی تقسیم اس قدر اُلجھے ہوئے مسائل ہیں اور

ان میں افکار و خیالات کا اتنا شدید اختلاف موجود ہے کہ موجودہ عصر کی بنیادیں ان اختلافات کے طوفان سے کانپ رہی ہیں — صنعتی کش مکش، طبقہ وار چپقلش، اور کہیں کہیں خانہ جنگی تک نوبت پہنچ چکی ہے اور خطرہ ہے اس اختلاف کی بنا پر یورپ دو متخاصم جماعتوں میں منقسم ہو جائے گا۔

حالات کی رفتار اور اختلافات کے دباؤ نے دنیا کو مجبور کر دیا کہ سماجی و معاشی نظام کے مختلف نقشوں کو علمی طور پر آزمائے اس وقت ساری دنیا معاشی و سماجی تجربہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ مختلف ممالک کے خصوصی حالات اور ان کی مخصوص روایات نے مختلف نقشوں کی طرف رہنمائی کی ہے اور مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کیے گئے ہیں۔ روس ایک نظام کو آزما رہا ہے، اور جرمنی و ایطالیہ دوسرے نظام کو، برطانیہ اور شمالی یورپ کے ممالک ایک تیسرے نظام کو اختیار کر رہے ہیں جو کچھ دنوں سے ممالک متحدہ امریکہ میں بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

روس میں انسانی آبادی کا تقریباً ۱/۱۰ حصہ خشکی کے تقریباً ۱/۶ حصہ پر قابض ہے، ان کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ فوری طور پر ایک معاشی انقلاب کا ساتھ دیں۔ اور قوت و استبداد سے وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک ایسے نظام کا پابند بنایا جا رہا ہے جو منطق کے زور سے بنایا گیا ہے اور بے رحمی کی قوت سے چلایا جا رہا ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ صدیوں کی خرابی ایک نسل میں درست کر دی جائے —— نام تو ہے اشتمالیت لیکن حقیقتہً یہ ایک ایسی اشتراکی مملکت ہے جس میں اشتمالیت کے چند اجزا مخلوط کر دئے گئے ہیں — تمام ذرائع پیداوار اور اکثر زمینیں عملاً

تیار کی بنائی جا چکی ہیں، طبقہ واری عدم مساوات اگرچہ بالکل ختم تو نہیں کی گئی ہے مگر بڑی حد تک کم ضرور ہو گئی ہے۔ عمال کے لیے ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ضمانت ہے اور غیر عمال کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ تمام نسلی اور جنسی تفاوت ختم کر دیا گیا ہے البتہ مذہبی اختلافات ختم نہیں ہوئے ہیں لے

ساری دنیا کی آنکھیں روس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ یقیناً یہ ایک زبردست اقدام ہے بلکہ تاریخ عالم کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ دیکھئے یہ دوسروں کے لیے نمونہ بنتا ہے یا خطرہ کا نشان۔ یا تو روس رہنمائی کریگا یا دنیا کو یہ کہے گا کہ "شما حذر بہ کنید" ــــــ کچھ لوگ جوش اور اُمید کے ساتھ روس کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور کچھ لوگ خوف و خطرہ کے ساتھ۔

روس کے انقلابات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ روس کی حالت انقلاب کے پہلے بھی ساری دُنیا سے مختلف ایک مخصوص حالت تھی۔ ایک نہایت وسیع رقبہ جو انسانی وطن کا تقریباً ۱/۶ ہے ایک ہی مرکزی حکومت کے زیر انتظام تھا شہنشاہیت قائم تھی جس کے اختیارات کی کوئی حد نہ تھی۔ بادشاہت نہایت وحشیانہ

لے۔ روس میں ایک مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلہ میں کوئی ترجیح تو حاصل نہیں لیکن کسی مذہب کے پیرو کو اشتمالی جماعت کا رکن بننے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کوئی ایسا شخص جو کسی مذہب کا پیرو ہو وہ انتظامات و معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ (دیکھو کتاب سوویٹ کمیونزم جلد دوم صہ ۱۰۱۲ مصنفہ ایس، بی ویب۔)

اور متضاد اعمال کے ذریعہ حکومت کیا کرتی تھی، بادشاہ پر وہم پرستی اس طرح طاری تھی کہ اس کے اثرات ہر حکم و فرمان میں نمایاں نظر آتے تھے درباریوں کی حکومت تھی اور خود غرضیوں اور سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا نہ کہیں ذمہ داری کا احساس تھا اور نہ کسی حق و فرض کا تصور۔ کلیسائی نظام غلط تعلیم اور غلط تر مذہب کی ترجمانی کرتا تھا۔ اور اس طرح کرتا تھا کہ ذہن انسانی مذہب کی اُس شکل کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا ——— ملک میں کسان موجود تھے جو ابھی دو نسل پہلے غلامی سے آزاد ہوئے تھے، مزدور تھے جو کسانوں کی طرح افلاس میں ڈوبے ہوئے اور اُن ہی کی طرح ناخواندہ تھے، ان کی زندگیاں گندہ اور مصیبت زدہ ماحول میں بسر ہو رہی تھیں ——— یہ تھے وہ حالات اور یہ تھا وہ ماحول جس میں ایک انتقامی ذہنیت پرورش پانے لگی۔ ایک طبقہ پیدا ہوا جس کے ذہن میں انسانیت کے مقام نے جگہ پیدا کی اور انہوں نے ہر ممکن ذریعہ سے اور ہر قیمت پر انقلاب کی تمنا پیدا کر دی۔ نتائج و عواقب کا خیال ذہن و دماغ کے پچھلے پردوں میں ڈال دیا گیا۔ آہستہ آہستہ تعلیم پھیلتی رہی اور اس طبقہ کے لوگ بڑھتے رہے۔ انقلاب کی تمنا قوی سے قوی تر ہوتی رہی ——— ایک ایسی قوم کے سامنے جبر کی جہالت کا نقشہ اور کھینچ گیا، جنگ اور نہایت تباہ کن جنگ شروع ہوئی روس اپنے ملک سے دور اور نہایت غیر واضح مقصد کے لئے جنگ میں شریک تھا۔ اور ملک میں بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی۔ انقلاب کا وقت آ گیا اور روس کا مشہور انقلاب واقع ہوا ——— روس کے یہ مخصوص حالات تھے، ساری دنیا میں کوئی دوسری مثال اس صورت حال کو نہیں ملتی اس لیے روس کی تاریخ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں شاید نہیں دھرائی جا سکے گی

روس میں جس نظام زندگی کا تجربہ کیا جا رہا ہے اس کے نتیجہ سے متعلق کسی فیصلہ کا ابھی وقت نہیں آیا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ تجربہ کی کسوٹی پر یہ نظام کھرا نکلے گا یا کھوٹا۔ یقیناً روسی مزدوروں کی زندگی کا معیار مغربی یورپ کے اوسط درجہ تک بھی بلند نہیں ہو سکا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اس کی فوری امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس قدر پست معیار سے اتنی قلیل مدت میں بلند معیار تک لانا سوئیٹ نظام ہی نہیں شاید کسی نظام زندگی کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ روس کو اپنی دولت اور توانائی کا بڑا حصہ فوجی تیاریوں پر صرف کر دینا پڑا ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمادی جائے —— روس میں معاشی نظام کے ذریعہ جو ترقی کی جا سکی ہے اس کے متعلق بھی ابھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس کا آئندہ ردعمل کیا ہوگا۔ اور کسے معلوم ہے کہ آئندہ یہ ترقی تنزل سے نہ بدل جائے گی — اس میں بیم ورجا، دونوں کیفیتیں موجود ہیں۔ صرف اجتماعی فرائض کا احساس اس نظام کو جاری رکھ سکے گا یا نہیں، یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ابھی نہیں مل سکتا۔ یہ جوش و خروش جو انتقام اور انقلاب کے جذبات کا مرہون منت ہے کیا بہت دنوں تک باقی رہے گا؟۔ یا اگر باقی نہیں رہ سکتا تو آئندہ نسلوں کے لیے اس جوش و انتقام کی بجائے تربیت کے ذریعہ کام لیا جا سکے گا؟ کیا عام انفرادی جذبات پر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا جذبہ غالب رہے گا۔ کیا یہ "مذہب مادہ" جو متضاد اجزاء کا مرکب دکھائی دیتا ہے اپنا کام کرے گا؟ کیا آئندہ افکار و خیالات کی آزادی اس قسم کے معاشی نظام کے ساتھ ساتھ باقی رہے گی، اور کیا آزادی کے ساتھ صحیح افراد کا انتخاب ہو سکے گا؟ اگر یہ نہ ہو سکا تو بغیر اس کے ایک اچھا تمدن کس طرح باقی

رہ سکے گا؟ یہ اور اس قسم کے مسائل ہیں جن کا اس وقت فیصلہ کر دینا قبل از وقت ہے۔

جرمنی اور اطالیہ کی آمریت افلاس اور معاشی مساوات کے مسئلہ کو حل کرنے کی ایک بالکل مختلف تدبیر رکھتی ہے — وہاں حصول منافع کے لیے ملازمت کی اجازت تو ہے لیکن حکومت سرمایہ داری کی پیدا کردہ معاشی موجوں کو محصولوں اور معاوضوں کے ذریعہ قابو میں رکھتی ہے۔ جرمنی اور اطالیہ میں جو تصورات کام کر رہے ہیں وہ سخت بھی ہیں اور پریشان کن بھی دوسرے ممالک کے لیے ان میں رہنمائی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔

تیسرا نظام کسی مخصوص نقطۂ خیال کی پیداوار نہیں، نہ کبھی اس کے احصا و احاطہ کی تفصیل واضح کی جاتی ہے۔ اس نظام میں یہ بھی دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہ معیاری نظام ہے، لیکن ایک حد تک یہ مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اور مندرجہ بالا دونوں طریقوں سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس نظام کے اکثر اہم اجزاء ابتدائً جرمنی ہی میں پیدا ہوئے تھے، اور اب برطانیہ اور دوسرے بڑے ممالک میں یہاں اس کے دیگر اجزاء کی تکمیل ہو رہی ہے —

اگر مسئلہ افلاس کی پوری طرح تحقیقات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اسباب دو قسم کے ہیں، شخصی، اور سماجی۔ افلاس کا دور دورہ مختلف اسباب کی وجہ سے ہو سکتا ہے، مثلاً ایک گھر ہے جس میں صحت کی خرابی کمزوری اور بری عادات کی وجہ سے خوش حالی نہیں آنے پاتی، دوسرا گھر ہے جس میں بے کاری، مزدوری کی ناقص شرح، اور کام کا عدم تسلسل خوش حالی و فراغ بالی نہیں پیدا ہونے دیتا — ہزارہا گھرانے ہیں جہاں بیماری اور حوادث نے تباہی پھیلا رکھی ہے، اسی طرح قمار بازی، شراب خوا

بے ایمانی، اور کاہلی نے لاکھوں خاندانوں کو تباہ کر رکھا ہے ــــ کسی معاشی نظام کی ناکامی سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو تباہ کر دیتی ہے ــــ شخصی غلطیوں کا اثر بھی افراد اور خاندانوں پر پڑتا ہے، لیکن افراد کی غلطیاں بھی بالواسطہ سماج ہی کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر اجتماع اور سماج اس کی اصلاح کرنا چاہیئے تو اصلاح بہ آسانی ہو سکتی ہے، اور کوئی طاقت اس اصلاح کو نہیں روک سکتی ــــ برطانوی نظام شخصی و سماجی دونوں پر حاوی ہے، اس میں اصلاح کی دونوں صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور دونوں کے لیئے مختلف رضاکارانہ نظام حکومتی تعاون کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں قومی تعلیم کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ برطانوی اصول سیاست میں آزادی عمل کو ۱۸۷۰ء کے قانون تعلیم ابتدائی کے ذریعہ محدود کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد سے مدارس، کلیات۔ جامعات، اور تعلیمی وظائف وغیرہ میں ترقی شروع ہوئی۔ ہماری تعلیم افراد ہی نہیں بلکہ سماج و اجتماع کی بھی اصلاح کرتی ہے اسی طرح عدم مساوات اور افلاس دونوں کا علاج کر رہی ہے، ناخواندہ طبقہ، اکثر کاہل اور غیر کارکرد ہوتا ہے اس لیئے افلاس کا شکار بنا رہتا ہے۔ جہالت انسان میں احساس کمتری پیدا کرتی ہے۔ عام تعلیم اور سب کے لیئے ترقی کے برابر مواقع مہیا کرنا سماجی ناانصافی کے خلاف یقیناً ایک موثر اقدام ہے۔

اجتماعی حالت کو درست کرنے اور ماحول کو بہتر بنانے کا کام ہو رہا ہے اس سلسلہ میں ایک طاقتور تحریک انیسویں ہی صدی میں شروع ہو گئی تھی۔ اور موجودہ صدی میں تو اس مقصد کے حصول کے واسطے وسیع پیمانہ پر جدوجہد

ہو رہی ہے۔ رہائشی مکانوں کی بہم آوری، اور صحت عامہ کی ترقی کے لئے نمائندہ ادارہ جات، رضا کارانہ تنظیموں اور منضبط قوانین کا ایک زبردست نظام مرتب کیا گیا جو کام کر رہا ہے۔ صحت عامہ کے اصول پر اچھے اور صحت بخش شہروں کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔ لوگوں کے تازہ دم رہنے اور تکان کو دفع کرنے کے لئے مختلف آسانیاں مہیا کی جا رہی ہیں۔ شرابوں کی فروخت پر پابندیاں بھی کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ تقریباً تیس ہزار ایسے اڈے اب تک ویران کئے جا چکے ہیں جہاں سے کبھی ویرانی پھیلائی جاتی تھی۔

قومی تنظیم نے اپنے تمام اراکین کو زندگی کی ابتدائی ضرورتوں کے مہیا کرنے کی ضمانت دی ہے، مریضوں ضعیفوں، بیواؤں اور یتیموں کے لئے مختلف قسم کی آسانیاں پیدا کی جا رہی ہیں، اندھوں، بہروں، کمزوروں، بیکاروں اور صنعتوں میں اتفاقی حوادث کے شکار ہو جانے والوں کے لئے کسی نہ کسی طرح امداد و اعانت کا انتظام کیا گیا ہے ــــ یہ سارے انتظامات کسی نہ کسی پیمانہ پر آفت رسیدگان کے لیے آخری سہارا کا کام دے رہے ہیں۔

تقریباً ایک سو سال سے مسلسل جد و جہد جاری ہے کہ مزدوری کی شرح کو بلند کیا جائے، کام کے اوقات کو کم کیا جائے، اوقات کارگزاری میں یکسانیت پیدا کی جائے مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ صحت و تندرستی کے ساتھ رکھا جائے ــــ کاروبار میں جماعتی سوداگری اور اجتماعی نظم قائم کیا گیا ہے۔ ٹریڈ یونین جسے ابتداء میں غیر آئینی اور موجب تعزیر قرار دیا گیا تھا، اب کھلے بندوں اطمینان کے ساتھ کام کر رہی ہے، اور ایک مسلمہ ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے ــــ آج کل کارخانہ داروں اور

مزدوروں کے مابین معاملات کے تصفیہ کا جو طریقہ عام طور پر رائج ہے وہ یہ ہے کہ ایک نمائندہ مزدوروں کا اور ایک کارخانہ دار کامل کر تصفیہ کرتا ہے، اور اگر دونوں میں اتفاق نہ ہو سکے تو معاملہ غیر جانب دار ثالث کے سپرد کر دیا جاتا ہے یہ طریقہ ابتدا میں کارخانہ داروں کے نزدیک اُن کے حقوق و اختیارات میں بے جا دخل اندازی سمجھا جاتا تھا، لیکن آج اتنا عام ہے کہ کسی کو اس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہے — صنعتی قوانین کے ضخیم اور منضبط مجموعے جن میں مزدوروں کی صحت، عافیت، اوقات کار، شرح اُجرت وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، ملک میں رائج ہیں زرعی مزدور اور چند ایسے ہی کام بجالانے والے جن میں ابھی تک جماعتی طریقہ، کار رائج نہیں ہوا ہے، ان قوانین کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔ ایک زبردست تحریک جائدادوں کی اور زیادہ مساویانہ تقسیم کے لئے شروع ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو سارے ملک میں جمعیۃ ہائے امداد باہمی کا جال بچھا ہوا ہے۔ مکانوں کی تعمیر کے لئے سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں، اور سیونگ بنک کام کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عمال کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو خود بھی چھوٹے چھوٹے صاحبان جائداد کی حیثیت رکھتی ہے۔ قومی دولت کا ایک بڑا حصہ آج ان ہی عمال کے قبضہ میں ہے — دوسری طرف ٹیکسوں نے بڑی بڑی آمدنیوں کے معتد بہ حصہ کو اجتماعی ضروریات کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ ان ٹیکسوں سے کچھ تو سماجی و اجتماعی کام انجام پاتے ہیں اور کچھ قومی دفاعات اور تحفظات میں صرف ہوتے ہیں — یہ ٹیکس مذکورہ مقاصد کے علاوہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر بھی لگائے گئے ہیں کہ جمہوری دستور دولت کی بہت زیادہ غیر مساویانہ تقسیم کے ساتھ مناسبت نہیں

رکھتا ــــ موجودہ صدی میں حکومت برطانیہ نے ٹیکسوں کے اصل اصول کو بڑی حد تک بدل دیا ہے ــــ کسی جائداد غیر منقولہ یا کاروبار میں لگائے ہوئے سرمایہ سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ٹیکسوں کی شرح کمائی ہوئی آمدنی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور وراثت میں حاصل ہونے والی جائدادوں پر تو یہ شرح بہت ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح حکومت ایک دولت مند آدمی کی زندگی میں مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ اس کی دولت کا تقریباً نصف حصہ اپنے قبضہ میں کر لیتی اور باقی نصف وفات کے بعد وارثوں تک پہنچتے پہنچتے حکومت کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔

اگرچہ سرمایہ داری کے اصولی مسئلہ کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی تجربہ کیا جا رہا ہے۔ نظری طور پر یہ چیز تقریباً مسلم ہے کہ طریقہ سرمایہ داری کو قومی طور پر تسلیم کر لینا نہ صرف اچھا نہیں ہے بلکہ گوناگون خطرات کا موجب ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ایک زبردست انقلاب بپا ہو جائے ــــ پچھلی جنگ کے بعد جائداد اور ملکیت کے نئے قواعد وضوابط بنائے اور جاری کئے گئے، یہ مختلف قسم کی جائدادوں کے لئے مختلف قسم کے قواعد ملکیت پیش کرتے ہیں۔ یہ درجہ کے اعتبار سے شخصی اختیارات سے لے کر اشتمالی ضوابط تک وسیع ہیں۔ یہ قواعد و ضوابط عملی تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جا رہے ہیں ــــ بہت ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے کچھ دنوں میں ایک ایسا معاشی نظام پیدا ہو جائے جو تصورات کی پرستش کرنے والوں کے مجوزہ نظاموں سے مختلف مگر ان سے کہیں زیادہ بہتر اور عملی ہو۔

ہماری سڑکیں، ہمارے پل، صحت عامہ کے ادارے، ہمارے

ابتدائی مدارس اور وظیفہ ضعیفی کا نظم خالص اشتمالی ادارے ہیں جنھیں عوام چلاتے ہیں اور عوام ہی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس کسی شخص کو ان اداروں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہو وہ بغیر کچھ خرچ کئے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ـــــ اسی طرح ڈاک خانے، تار گھر، بجلی اور گیس مہیا کرنے والی جمعیتیں سواحل، بندرگاہیں، مقامی حمل و نقل کے انتظامات اور اعلیٰ تعلیمی ادارے اشتراکی ادارے ہیں، ان سے جو فائدہ اٹھاتے ہیں وہ محصول دیتے ہیں لیکن ان کا منافع کوئی نہیں اور نہ کسی طرح ان سے شخصی نفع حاصل کیا جاتا ہے ــــ بیمہ کے جو مختلف طریقے رائج ہیں ان میں بعض خالص قومی ہیں، اور بعض تجارتی۔ لاسلکی کا محکمہ نہ تو حکومتی ادارہ ہے اور نہ نفع اندوزی کا ذریعہ، ملک میں تجارتی اداروں کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر امداد باہمی کے اصول پر قائم ہیں ــــــــ

تجارتی اداروں میں سے کچھ تو حصہ داروں کی مشترک کمپنیاں ہیں جن کا نظم و نسق ان ہی حصہ داروں کے ہاتھوں میں ہے لیکن قیمتوں پر نگرانی قائم ہے اور منافع کی مقدار متعین ہے۔ رہائشی انتظامات کرنے والے بعض ادارے یقیناً بعض افراد کی ملکیت ہیں لیکن ان کے منافع کی مقدار بھی متعین ہے۔ ریلوں کے کرایہ حکومت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ باقی رہے شخصی ملکیت کے تجارتی و صنعتی ادارے ـ تو یقیناً ایسے ادارے کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن ان پر بھی مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قوانین کا دباؤ موجود ہے، یہ دباؤ ایک اچھی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے

زمین پر ملکیت اور قبضہ کا جو طریقہ برطانیہ میں موجود ہے وہ ازمنہ وسطیٰ سے بہت کم امور میں مختلف ہے۔ اراضی کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہے جو حکومت یا

ارباب اقتدار نے عوام کی ضروریات کے لئے خرید کیا ہے۔ اور وہ بھی مکانات کی تعمیر اور ایسی ہی خاص ضرورتوں تک محدود ہے۔ کاشت کاروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کچھ قاعدے قانون تو بنائے گئے ہیں مگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو برطانیہ میں اراضی کا انتظام تقریباً اب بھی وہی ہے جو ازمنہ وسطیٰ میں موجود تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ باشندگان برطانیہ کی زندگی جو بڑی حد تک مجموعہ اضداد یا متبائن اجزاء سے مرکب ہے دنیا کیلئے تعجب خیز ہے، ایک عمل دوسرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا۔ رفاہ عام کے ادارے بھی ہیں ماحول کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی ہیں، ایسے قوانین وضوابط بھی ہیں جو مزدوروں اور عاملوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں، اشتمالی ونیم اشتمالی ادارے بھی ہیں، ملکیت شخصی کو بے کار بھی کیا جا رہا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ ازمنہ وسطیٰ کا نظام اراضی بھی موجود ہے، شخصی ملکیت بھی ہے، جائدادیں بھی موجود ہیں ان پر سخت ٹیکس بھی لگے ہوئے ہیں۔

یہ صورت بالارادہ پیدا کی ہوئی نہیں ہے، جیسے جیسے ضرورت داعی ہوتی گئی تغیر و تبدل ہوتا گیا۔ منطق کے اصول پر مقدمات کی ترتیب کے ساتھ صغریٰ کبریٰ بنا کر یہ صورت نہیں پیدا کی گئی ہے۔ یہاں نہ مارکس کے تصورات ملحوظ ہیں، نہ لینن کا پیمانہ مقصود ہے، نہ نازی حکمت عملی سے کام لیا گیا ہے اور نہ اطالیہ کی فاسطیت مرغوب خاطر ہے ـــــ دوسرے ممالک کے باشندے اس صورت حال کو عجیب بلکہ عجیب تر سمجھتے ہیں۔

اشتراکیت کو ایک پالیسی کہا جاسکتا ہے، اشتمالیت ایک پالیسی ہے۔ اسی طرح فاسطیت ایک معاشی نظام رکھتی ہے۔ لیکن برطانوی نظام کو

کیا کہا جائے اس کا تو کوئی نام ہی نہیں ـــــ برطانوی نظام معاش کا نام ہو یا نہ ہو اسے بالارادہ بنایا گیا ہو یا بلا ارادہ بن گیا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ عمل کے میدان میں اسے کامیابی اور نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ برطانوی دستور برطانوی شہنشاہیت اور برطانوی قوانین اسی طرح ترقی کرتے رہے ہیں آج سے تقریباً ۳۰ یا ۳۵ سال قبل کے زمانہ پر ہم نظر ڈالتے ہیں اور اس برطانوی وزارت کے کارناموں پر غور کرتے ہیں جو سنہ ۱۹۰۶ء میں ترتیب پائی تھی تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء تک جب کہ پچھلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے صرف آٹھ سال کے عرصہ میں اس وزارت نے مفاد عامہ کے اتنے اہم اور شاندار کام انجام دئے کہ اس مدت میں کسی دوسری وزارت سے نہ ہو سکے۔ ہم ان کاموں کو کسی طرح غیر مربوط کارنامے نہیں قرار دے سکتے یہ ایک مرتب حکمت عملی کے ماتحت انجام پا رہے تھے۔ بلکہ ایسا سمجھنا چاہیئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا ایک مسلسل و مربوط نظام نامہ کا جزء تھا جس میں سے کچھ انجام پا چکا ہے کچھ انجام پا رہا ہے اور کچھ انجام پانا باقی ہے۔ اگرچہ سنہ ۱۹۰۶ء کی مذکورہ وزارت کے کارناموں کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن کیا اس وقت یا آج بھی برطانوی قوم یہ تسلیم کرنے کو تیار ہے کہ برطانیہ کی قومی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہوا۔ یا قوم نے اپنے سماج سے متعلق انقلابی تجویز کو عمل کا جامہ پہنایا۔ نہیں! برطانوی قوم نے تو برطانوی شہنشاہیت اور برطانوی دستور کے وجود کو بھی اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک کہ ان سے انکار ناممکن نہ ہو گیا ہماری پالیسی ایک حد تک خدمت انجام دے رہی ہے۔ مجموعی طور پر ہم اپنی قومی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہالت، بیماریاں

شرح اموات، شراب خواری اور جرائم میں کمی ہو رہی ہے۔ تعلیم بڑھ رہی ہے، صحت عامہ میں ترقی ہو رہی ہے۔ اور حیات انسانی کے لئے آج اتنی آسانیاں موجود ہیں جن کا تصور بھی ہمارے بزرگوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ ہم نے اس سلسلہ میں کیا حاصل کیا ہے، اور کیا کچھ کر چکے ہیں، اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ یہ سب کچھ نہ رہے تصور تو کیجئے کہ کسی سیاسی طوفان سے ہمارا موجودہ نظام حیات جو اتنی باقاعدگی اور اس قدر غور و فکر کے بعد بن کر تیار ہوا ہے یکایک تباہ ہو جائے اور ہم وہاں پہنچا دیئے جائیں جہاں ایک صدی پہلے تھے، تو کیا حال ہو گا، اس تصور کے بعد آپ کو نہایت واضح طور پر نظر آئے گا کہ اس ایک سو سال کی مدت میں ہم نے کیا حاصل کیا ہے۔

ہماری پالیسی ایک حد تک خدمت انجام دے چکی ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ افلاس بہر حال اب تک موجود ہے، اگرچہ نسبتہً پہلے سے کم وسعت کے ساتھ اور کم دردناک صورت میں موجود ہے لیکن بہر حال موجود ہے انکار کی گنجائش نہیں۔ دولت کی عدم مساوات کو کم کر دیا گیا ہے لیکن بہت تھوڑی مقدار میں کم کیا گیا ہے۔ ابھی بہت باقی ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارا سماجی نظام ابھی تک ناانصافیوں سے بھرا پڑا ہے۔ تجارتی اجارہ داریوں کی وجہ سے نئے نئے اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مفاد عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے ضرورت ہے کہ ان اجارہ داریوں کی روک تھام کی جائے۔ اور یہ صورت حال صرف برطانیہ ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی جہاں کی حالت برطانیہ سے کسی قدر مشابہ ہے، پائی جاتی ہے۔ اب اس وقت جو سوال ہمارے سامنے درپیش ہے وہ یہ

ہے کہ جو طریقۂ عمل اب تک رہا ہے وہ کافی ہے، اور اس کے ذریعہ مصائب کا علاج ہو جائے گا اور کروڑوں انسانوں کو چین و سکون میسر آسکے گا، یا نہیں کوئی زبردست انقلابی قدم اٹھا کر موجودہ نظام کو بدل دینا چاہیئے۔

اس اہم سوال کا ایک حتمی اور یقینی جواب دینے کی جرات کون کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اس امر پر غور کرنا نہیں ہے کہ موجودہ نظام میں کیا کیا خرابیاں ہیں بلکہ اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ اس موجودہ نظام کو جس دوسرے نظام سے بدلا جائے گا اس کے نتائج کیا ہوں گے اس کے عملی امکانات کس قدر ہیں۔ اور اس کا اثر کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ —— یہ کہ دینا کافی نہیں ہے کہ روس کا تجربہ ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس میں خطرات ہیں اور بہت ہیں۔ پھر یہ خطرات واضح طور پر نظر بھی آرہے ہیں۔

معاشی پہلو پر غور کرتے ہوئے پیداوار کے ناکافی ہونے کے مسئلہ کو آسانی کے ساتھ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا؛ یہ کہ دینا کافی نہیں کہ مشینوں اور سائنس کی مدد سے شرح پیداوار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جاسکتی اور ہر شخص کے لیئے زندگی کی آسانیاں مہیا کی جاسکتی ہیں۔ ہاں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے جب کہ صنایع کی اچھی تنظیم کی جائے اور تمام کاروبار اطمینان و سکون کے ساتھ چلتے رہیں لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہمیشہ ایسا نہیں ہوسکتا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ غیر متوقع حالات کبھی نہ پیدا ہوں گے صنایع کی پیداوار میں ۱۰ یا ۲۰ فیصد کمی ہوجاتی ہے، پبلک فینانس کے انتظام میں انسانوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، ناتجربہ کاری سے بھی نقصانات ہوتے ہیں۔ سکہ کے اتار چڑھاؤ کا اثر تجارت پر پڑتا ہے۔ صرف دولت کی مساوی تقسیم فراغبالی کی ضمانت نہیں ہوسکتی بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ پیداوار ضرورت سے

زیادہ یا کم از کم ضرورت کے برابر ہو، اگر یہ نہ ہو سکا تو فراغ بالی خواب وخیال ہی رہے گی۔ ایسی صورت میں مزدوروں کے لئے موجودہ یا آسانی مستقبل کے کچھ نہیں یا بہت کم سے بہتر ہے۔

دوسرا اہم ترین مسئلہ پیداوار دولت کی اجارہ داری کا وہ اثر ہے جو آبادی پر پڑتا ہے۔ اسی طرح اس مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مزدوروں سے کام لینے کا حق کسے حاصل ہے اگر اس حق کی بھی اجارہ داری قائم ہو تو مسئلہ اور زیادہ قابل غور ہو جاتا ہے ـــــ اگر حکومت اور صرف حکومت ہی کو مزدوروں سے کام لینے اور پیدا آور ذرایع کے استعمال کا حق حاصل ہو تو کیا افراد آبادی کے بحیثیت مزدور و بحیثیت صارف جملہ حقوق محفوظ رہیں گے؟ روسی حکومت نے یہی طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے وہاں مزدوروں سے کام لینے اور پیدا آور ذرایع کے استعمال دونوں کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے۔ لیکن روس کی اس میدان میں کامیابی یقینی نہیں موجودہ عہد ہی میں کامیابی مشتبہ ہے دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ نسلوں میں اس نظام کا کیا حال ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ تورثی ثقافت کی حفاظت کا ہے، کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ آج تک جو ایجادات ہوئیں، علوم وفنون میں جو ترقیاں ہوسکی ہیں اور تہذیب و تمدن کی پیش رفت جو دکھائی دیتی ہے وہ ساری کی ساری مرہون منت ہے فارغ البال خاندانوں اور فارغ البال افراد کی، کم از کم موجودہ صدی میں تو یہی فارغ البال افراد تہذیب کے سکون اور امن کا سبب بنے ہوئے ہیں ضروری ہے کہ آئندہ کے لئے بھی ان خدمات کے مواقع کا انتظام قایم رکھا جائے۔ بقول ارنلڈ متی بہت سے لوگ اچھے لوگ بننا چاہتے ہیں

یہ تو بہتر ہے مگر اچھے لوگوں کا معیار ان کے خیال کے حد تک پست نہیں کیا جا سکتا"۔۔۔۔۔ موجودہ نظام کا بدل تو دریافت کیا جا سکتا ہے، بلکہ تبدیلی بڑی حد تک شروع ہو چکی ہے۔ لوگوں میں صلاحیتیں بھی ہیں جو آہستہ آہستہ نمایاں ہوں گی لیکن سوسائٹی کے لئے دانائی کا عمل یہ ہوگا کہ جدید کو اختیار کرنے سے پہلے ہی قدیم کو تباہ نہ کر دے ورنہ دونوں کے مابین ایک خلاء پیدا ہو جائے گا اور خطرہ ہے کہ بہت سے قیمتی عناصر ہمیشہ کے لئے کھو جائیں۔

یاد رکھو! ہر وہ طریقہ کار جو انقلابی انداز میں یکایک اور فوری طور پر اختیار کیا جائے گا وہ جتنی ناانصافیوں کا علاج کرے گا اس سے کہیں زیادہ ناانصافیاں پیدا کر دے گا۔ روسی انقلاب پر نظر ڈالو اس انقلاب کے ساتھ کتنی بے رحمیاں اور خون کی کیسی ندیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس انقلاب نے نہ صرف لاکھوں انسانوں کو مادی ذرائع سے محروم کر کے تباہ حال بنا دیا بلکہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ تعداد ان انسانوں کی ہے جو جبری محنت، قید، جلا وطنی یا موت کے شکار بنا دئے گئے۔ فارغ البال خاندانوں کو یکایک ختم کر دینے کے فیصلہ نے تقریباً دس لاکھ خاندانوں کو ویران اور کروڑوں عورتوں، مردوں اور بچوں کو تباہی و بربادی میں مبتلا کر دیا۔ مسٹر اور مسز ویب جنھوں نے روسی حالات کا مطالعہ کیا ہے اور جن کی رائے روس کے جدید دور کے موافق ہے، بیان کرتے ہیں کہ"

"روس کے اس انقلاب کا شکار کتنے انسان ہوئے ان کی تعداد بیان اور مثال سے باہر ہے"

انسانیت کے نام پر جو تحریک شروع کی جائے اسے کم از کم اس قدر غیر انسانی نہیں ہونا چاہیئے، ورنہ جبر و تشدد بھی بقول کارلائل اپنے انداز میں انصاف پرور ہوتا ہے۔

یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جنھیں غیر اہم قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے یہ ٹھیک ہے کہ طبقۂ امراء کے خود غرض افراد عموماً ان ہی مسائل کی پناہ لے کر کسی وسیع معاشی انقلاب کی مخالفت کرتے ہیں، خطرات کو حقیقی تباہی بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انقلاب ایک ہوا بن جائے، مگر مبالغہ کو ایک طرف کر دینے کے بعد بھی بہر حال حقیقت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ فوری انقلاب میں خون ریزی و تباہی لازمی ہے، اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تبدیلی ہونی چاہیئے مگر بتدریج انقلاب کے ذریعہ تبدیلی کارآمد نہیں ہو سکتی۔

اصلاح و تبدیلی کی طرف قدم ضرور اُٹھانا چاہیئے، رہی تیز رفتاری یا سست قدمی تو اس کا دارومدار مخالفت و مقاومت کی قوت ہے جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق قدم اُٹھنا چاہیئے۔ بہت سے صاحبان جائداد اپنی خود غرضی سے جتھا بنا کر اس کی مخالفت کریں گے اور ثابت کرنے کی سعی کریں گے کہ سوسائٹی کی بنیاد ان ہی کی وجہ سے پائدار ہے، اور وہی لوگ ہیں جو منزل صنعت کے راہ پیما کہے جا سکتے ہیں۔ یہ تو ایک قدیم اُصول ہے کہ غرض خود اعتقاد بن جاتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ صاحبان جائداد کی اس مخالفت کو استحکام و دوام حاصل رہے۔ اور ہمیشہ حاصل رہے

اُنیسویں صدی کی ابتداء میں جب برطانیہ میں اجتماعی بے چینی کی ایک موج اُٹھی اور دستوری اصلاحات رونما ہوئیں تو ان کی کامیابی صرف

ادنیٰ طبقہ کی محنت، استقلال اور اتحاد کا پھل نہ تھا بلکہ یہ کامیابی دربار کے بہت سے امرا اور بااختیار طبقہ کی مرہون منت تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ایک زبردست انقلاب کا خطرہ ملک کو لاحق تھا، بہت سے لوگ جو ادنیٰ طبقہ کو حقوق دینے سے اختلاف رکھتے تھے، نہایت وسعت صدر کے ساتھ اس کے لیئے تیار ہو گئے، اس وقت معاشی، سیاسی اور سماجی سارے امور اس ہیجان کے نتیجہ پر منحصر تھے، لیکن نہایت پرسکون اور باامن طریقہ پر معاملہ طے ہو گیا — جو لوگ پارلیمان چلا رہے تھے وہ کشادہ پیشانی کے ساتھ جدید دستور کے لئے تیار ہو گئے — کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ موجودہ بے چینی کا بھی ایسا ہی پرسکون حل نہ دریافت کر لیا جا سکے۔ معاشی معاملہ بھی سیاسی معاملہ کی طرح طے کیا جا سکتا ہے۔

ہر طبقہ میں یہ جذبہ موجود ہے کہ افلاس اور سماجی ناانصافیوں کو ختم کر دیا جائے۔ غور فرمایئے کہ توریثی دولت پر اتنا سخت ٹیکس ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں لگایا گیا تھا لیکن شاید ہی کوئی شخص ہو جو اس ٹیکس کے خلاف خیالات رکھتا ہو اس کے بعد آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ آئندہ سو پچاس سال میں افلاس اتنا ہی باقی نہیں رہ سکتا جتنا کہ اب ہے۔ اُس وقت آبادی کا ایک بڑا حصہ افلاس کا شکار نہیں دکھائی دے گا — کسی شدید خون ریزی بلکہ ادنیٰ مخالفت کے بغیر پچھلی دو تین نسلوں میں صورت حال بڑی حد تک بدل چکی ہے اور عوام اپنے صحیح مقصد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور اُمید یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اس مقصد کی طرف رفتار زیادہ تیز ہو جائے گی کیونکہ ایک عام ہمدردی افلاس زدہ طبقہ کے ساتھ موجود ہے۔

اور اگر یہ اُمید پُوری نہ ہوئی تو صورت حال بالکل واضح ہے برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں سماجی حالت جس درجہ پر پہنچ چکی ہے، عام رضامندی کے ساتھ اگر تبدیلی نہ ہوسکی تو لازماً انقلاب برپا ہو جائے گا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ "اگر تونگری موجود ہے تو افلاس بھی ضرور رہے گا" بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "اگر افلاس باقی رہا تو تونگری ہرگز نہ رہ سکے گی"!

بارھواں باب

آزادی

آزادی

ہمارے دور کی دوسری الجھن وہ اختلاف ہے جو مسئلہ آزادی پر پیدا ہو گیا ہے۔ موجودہ صدی کی جب ابتدا ہوئی تھی اس وقت یہ مسئلہ تقریباً متفقہ مسئلہ معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی کہیں کہیں کوئی اختلاف موجود رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ممالک میں آزادی کے حصول کی طرف اقدام قابل ذکر نہ ہو، مگر دنیا کے ہر حصہ میں روشن خیال حضرات کا نصب العین آزادی تھا۔

قوموں کو دوسروں کے تسلط سے آزاد ہونا چاہیئے، یہ تھا اس وقت کا مسلمہ نظریہ۔ انیسویں صدی میں نیولین کا یہ خیال کہ سارے یورپ پر تسلط حاصل کرے ناکام کیا جا چکا تھا جنوبی اور وسطی امریکہ میں عمومیت پیدا ہو چکی تھی، اطالیہ پر جمہوری رنگ چھا رہا تھا اور بلقانیوں کو آزادی مل چکی تھی۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں جو نمونۂ حکومت موجود تھا وہ یہ تھا اور اُمید کی جاتی تھی کہ یہی نمونہ عام طور پر قبول کر لیا جائے گا۔

ہر قوم کو اپنی آپ حکومت کا حق حاصل ہے۔ امریکہ اور فرانس کی نو عمر جمہوریتیں شباب پر آچکی تھیں، برطانیہ کا دستور حکمرانی بھی تقریباً ایک

نقشہ پر آگیا تھا۔ برطانوی مستعمرات حکومت خود اختیاری کی مشتاق تھیں۔ جرمنی، آسٹریا جاپان اور ترکی میں پارلیمانیں قایم ہو رہی تھیں، حتیٰ کہ زار کی حکومت روس میں بھی مجلس حکومت بن گئی تھی، ہندوستان اور چین میں حرکت شروع ہو گئی تھی۔ مہذب دنیا کے لیئے اس وقت یہی ایک نقشہ تھا۔

قوم میں ہر فرد آزاد ہو، خیالات میں آزاد ہو، زبان میں آزاد ہو، مذہب میں آزاد ہو، اور عمل میں بھی اتنی آزادی رکھتا ہو جتنی کسی دوسرے فرد کو حاصل ہو، عدالت کی طرف سے سب کی برابر حفاظت کی جاتی ہو، قانون کے حدود میں جو کام چاہے کر سکے۔ جان اسٹوارٹ نے ایک بار وضاحت سے ان حقوق کو بیان کر دیا تھا، اور یہ طے شدہ تھا کہ عورت کو ان تمام امور میں مردوں کے برابر حق حاصل ہو گا۔

انیسویں صدی کے ختم سے پہلے پہلے دنیا ایک دوسری قسم کی آزادی کا تصور بھی کرنے لگی تھی جس کے متعلق یہ باور کیا جاتا تھا کہ یہ آزادی سیاسی آزادی سے کم درجہ کی چیز نہیں، یہ تھی "معاشی آزادی" اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان پیدایش سے لے کر موت تک افلاس، محنت شدید اور برُے ماحول کی بیڑیوں میں پا بجولان نہ رکھا جائے، معاشی آزادی صرف ان بیڑیوں کے کٹ جانے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ افراد انسانی کے لیے ترقی اور فارغ البالی کے یکساں مواقع مہیا کیئے جائیں۔ ٹریڈ یونینوں اور قانون کی قوت کے ذریعہ مزدوروں کو آزاد کرایا جائے اور موجودہ صنعتی نظام کو بدلا جائے۔

آزادی کوئی مفرد و بسیط شئے نہیں ہے، اس کے بہت سے اجزا ہیں۔

اور کم از کم چار اجزار تو بہت نمایاں ہیں:- (۱) قومی آزادی (۲) سیاسی آزادی (۳) شخصی آزادی اور (۴) معاشی آزادی، وہی شخص کامل آزاد کہا جا سکتا ہے جو ایک ایسے ملک میں زندگی بسر کرتا ہو جس پر کسی دوسرے ملک کا تسلط نہ ہو، ایک ایسی مملکت میں زندگی بسر کرتا ہو جس میں سب کے حقوق برابر ہوں، ایک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کرتا ہو جس میں قانون سب کے لیے یکساں ہو، اور پابندیاں کم سے کم عائد کی گئی ہوں، ایک ایسے معاشی نظام میں زندگی بسر کرتا ہو جہاں اس کے لیے فراغ بالی حاصل کرنے کے تمام دروازے کھلے ہوں، زندگی کی عام ضرورتوں کے لیے اجتماعی ضمانت ہو، اور جہاں ایک شخص اپنی صلاحیت سے سب کچھ ہو سکتا ہو۔

بہت دن نہیں ہوئے کہ یہ تمام امور عام طور پر متفق علیہ اُمور سمجھے جاتے تھے، اور یہ باور کیا جاتا تھا کہ آزادی بڑی اچھی چیز ہے اسی لیے آزادی کو سیاسیات میں اصل اصول کا درجہ عطا کر دیا گیا تھا۔ اگر قومی آزادی اسٹریلیا، روس، ترکی، آئرلینڈ اور ہندوستان کو پوری طرح حاصل نہ تھی، اگر بعض پارلیمانوں کو پورے حقوق حاصل نہ تھے، اگر جبری قوانین کہیں کہیں موجود تھے اور اگر ٹریڈ یونینوں کو کچل کر کہیں کہیں مزدوروں کو ظلم و تعدی کا شکار بنایا جا رہا تھا تو یوں سمجھیے کہ آہستہ آہستہ غائب ہو جانے والے ماضی کی یہ مکروہ یادگارین تھیں، اور رفتارِ عالم خود بخود ان تمام اُمور کو ختم کر کے انسانیت کو اس سے نجات بخش دیتا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ جب ختم ہوئی اور صلح کی کانفرنس بیٹھی تو اس وقت یہ رہ باقی تھی، پولستان، چیکس سلواکس اور بلقانی و بلطیقی ریاستوں کو قومی

حقوق دئے گئے۔ عربوں کو ترکوں سے الگ کیا گیا۔ مشرقی یورپ کی تین شہنشاہتیں پردہ وجود سے مٹا دی گئیں۔ بعض ممالک میں پارلیمانیں قائم ہوئیں، اور جہاں قائم تھیں وہاں ان کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا ـــــ البتہ روس میں آمریت قائم ہوگئی، لیکن ایسی آمریت جو عوام کی فلاح کے لئے سب کچھ کرنے اور سب کچھ کہنے کو تیار تھی ـــــ اختتام جنگ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آئرلینڈ کو حکومت خود اختیاری حاصل ہوئی۔ اور ہندوستان کا حکومت خود اختیاری کی طرف ایک نمایاں قدم اُٹھا۔ تقریبًا ہر جگہ شخصی و معاشی آزادی میں ترقی ہوئی۔

اب یورپ کے ایک بڑے حصہ میں یکایک ردعمل شروع ہوا۔ وجوہ واسباب صاف واضح تھے۔ معاشی بدحالی نے تقریبًا تمام طبقوں کو تباہ کر رکھا تھا، سکہ کا بھاؤ گر گیا تھا، کم شرح اُجرت اور بے کاری نے صنعتی بے چینی پیدا کر دی۔ جمہوری مملکتوں نے اپنے کو اس معاملہ میں دخل دینے کے ناقابل ظاہر کیا۔ شکست خوردہ ممالک میں قومی جذبات نے معاشی بدحالی سے مل کر بغاوت پیدا کر دی، ترک اسلحہ کا قاعدہ بنایا گیا تو یک طرفہ تھا، اور اسے بجبر نافذ کیا گیا۔ ان تمام حالات نے حوصلہ مند اور قابوجی افراد کے لئے کام کے مواقع پیدا کر دئے، معاشی بے چینی سے تنگ آجانے والے لاکھوں افراد کی تائید انھیں حاصل ہوگئی، اور کیوں نہ حاصل ہو جاتی جب کہ عام طور پر اچھے حالات اور چلتے روزگار کی تمنائیں موجود تھیں ـــــ انھوں نے اس وقت کے نافذ دستور کو ختم کر دیا اور ایک ایسے سیاسی فلسفہ کو سامنے رکھ کر ختم کر دیا جس کی ابھی تک کوئی عملی تفسیر نہ ہو سکی تھی۔ اور نہ چند سال پیشتر تک کوئی اس فلسفہ سے

واقف تھا۔

یہ فلسفہ انتہائی سختی کے ساتھ قومی بلکہ نسلی اجتماع پر زور دیتا ہے، جمہوریت کا مخالف ہے اور فوجی قوت سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کی تکمیل میں بہت سے مفکرین نے کام کیا ہے۔ ہیگل، فشتے، نتشے، ہاسٹن اسٹواٹ چمبرلین، سورل، کروس، اور برگسان وغیرہ نے اسے تیار کیا ہے، اور اطالوی فاسطیت اور جرمن نیشنل سوشلزم میں اس فلسفہ کا ڈھانچہ بن کر تیار ہوا ہے۔ دوسرے بعض مقامات پر بھی اسے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ فلسفہ اور اس کی عملی تفسیر تاریخ یورپ میں ایک وقتی ہنگامہ کی حیثیت رکھتی ہے یا مستقبل کے لئے ایک مستقل نمونہ کا کام دے گی اور یہ ایک ایسا عقیدہ ثابت ہوگی جو پچھلے ڈیڑھ سو سال کی مسلسل جدوجہد اور تمام افکار و خیالات کو بدل کر دنیا کا جدید نقشہ قائم کر دے گا۔؟

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے اس جدید فلسفہ کی بنیاد اس پر ہے کہ عقلیت کو نظر انداز کر کے صرف قلبی آواز اور وجدان پر بھروسہ کیا جائے، نتشے، کروس، اور برگسان کے دماغی افکار کا یہ سب سے بڑا عطیہ ہے۔ اس سے ایک قسم کا سیاسی تصوف پیدا ہوتا ہے۔ اس سیاسی تصوف کی بہترین مثال ہٹلر کی وہ تقریر ہے جو اس نے رہائن لینڈ پر قبضہ کرنے کے مابعد نشر کی تھی، یہ تقریر سارے جہاں کو مخاطب کر کے کی گئی تھی، اس میں کہتا ہے:۔

میں اس یقین کے ساتھ جو کسی ملہم بالغیب کے قلب میں ہو سکتا ہے

اپنی راہ پر چل رہا ہوں، اُس راہ پر جو میرے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے"۔

وجدان والہام کے مسئلہ پر پچھلے باب میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ اگر اس بحث کے نتائج کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ وجدان اور ضمیر کی آواز کو بھی عقل و فراست کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے اور بہرحال فراست کو وجدان اور ضمیر کی آواز پر برتری حاصل رہنی چاہیئے تو فاسطیت اور نازیت کو اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس فلسفہ کا دوسرا بنیادی عقیدہ عسکریت ہے، اس عقیدہ پر آئندہ باب میں جہاں بین الاقوامی تعلقات پر بحث ہوگی پوری طرح بحث کی جائے گی۔

تیسری بنیاد ہیگل کا نظریہ مملکت ہے جس میں فرد مملکت کے ماتحت قرار دیا گیا ہے، خود فرد کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مملکت ہی سب کچھ ہے۔

ہیگل کا عقیدہ یہ ہے کہ مملکت خود ایک زندہ وحدت ہے جس کو خود بخود حقوق اور اقتدار حاصل ہے ہیگل کہتا ہے کہ:۔

"مملکت ایک لاہوتی خیال ہے جو کرۂ ارضی پر ظاہر ہوتا ہے زمین پر اُسے اقتدار مطلق کا مقام حاصل ہے، یہ خود اپنی غرض و غایت ہے، یہ سب سے آخری طاقت جسے افراد انسانی کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے حقوق حاصل ہیں"۔

یہ ہے وہ مابعد الطبعیاتی عقیدۂ ربانی جسے جرمنی اور اٹلی میں اختیار کیا گیا ہے۔ فاسطی اعلان کے ابتداء ہی میں اس کا اظہار کیا گیا ہے۔

فاسسطی نظام کا وہ پہلا اعلان جو "منشور آزادی" کے نام سے موسوم ہے، اس میں لکھا ہے:۔

"اطالوی قوم اپنی طاقت اور سرمدیت کے ساتھ ایک تنظیم ہے جس کا اپنا وجود ہے، اپنی غرض و غایت ہے اور خاص اعمال ہیں، یہ وجود، غرض اور اعمال ان افراد یا جماعتوں کے وجود، اغراض اور اعمال سے بالاو برتر ہے جن کے مجموعہ کا نام اطالوی قوم ہوتا ہے"۔

قدیم مذہب سے بے گانگی نے ایک روحانی خلاء پیدا کر دیا ہے اور معبود مطلق کے اعلیٰ تصور سے اسے پر نہیں کیا گیا کہ اعمال و افکار کے لئے بنیاد کا کام دے سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ خلاء مختلف قسم کے وہمی بتوں کا مقام بن گیا۔ ایک برتر مملکت اور ایک برتر قوم کا تصور بھی ان بتوں میں سے ایک بت ہے۔ جرمنی میں ان ہی اصول پر ایک جدید مذہب پھیلایا جا رہا ہے۔ نمونہ کے لئے نوجوان جرمنی کے لیڈر ہربالڈر فان شیرلش کے بیان کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہ جرمن تنظیم خدا کے تصور سے خالی ہے فرماتے ہیں۔

"خدا کے انکار کے بعد کوئی شخص اچھا جرمن نہیں ہو سکتا لیکن غیر فانی جرمنی پر عقیدہ کا اظہار خود غیر فانی خدا پر ایمان کا اظہار ہے، ہمارے لئے جرمنی کی خدمت اور خدا کی عبادت ایک ہی چیز ہے۔ اگر ہم سچے جرمن کی طرح عمل پیرا ہوں تو یقیناً ہم خدا کے قانون کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔ جس نے اڈولف ہٹلر کی اطاعت کی اس نے جرمنی کی اطاعت کی اور جس نے جرمنی کی

اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی"۔

آیئے اس زندہ مملکت کی حقیقت کو عقل وفکر کی کسوٹی پر آزمائیں، مملکت کیا چیز ہے، ظاہر ہے کہ مملکت چند مردوں اور عورتوں کی محدود تعداد سے زیادہ کچھ نہیں جو کسی مقصد یا کسی عمل کے لیئے باہم منظم ہوں، انسان فطری طور پر ایک اجتماع پسند ذی روح ہے اس کی فطری خواہش اور دماغی رد خود اسے باہمی تعاون پر مائل کرتی ہے، لیکن اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ جب خاص طریقہ پر تعاون پیدا ہو تو اس اجتماع میں کوئی حقیقت ثلبتہ بھی پیدا ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ چند نوجوانوں نے ایک ٹینس کلب بنایا جہاں وہ مقصد واحد کے لیئے اکٹھے ہوتے ہیں تو کیا اس کلب میں کوئی ما بعد الطبعیاتی حقیقت پیدا ہو جائے گی۔ کلب اور قوم میں پیمانہ کے علاوہ اور کیا فرق ہے خانوادوں نے سرداران قبیلہ کے ماتحت اپنی تنظیم کی، اور مختلف قبائل نے مل کر ایک قوم بنا ڈالی، اس سے کوئی حقیقت لاہوتی کیسے پیدا ہو جائے گی/۔

دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ مملکت بھی ایک عضویاتی نظام ہے، ہربرٹ اسپنسر نے اپنے مشہور مقالہ میں لکھا ہے لیکن یاد رکھئے "عضویات" فن "حیاتیات" کی اصطلاح ہے اور ظاہر ہے کہ مملکت کوئی حیاتی چیز نہیں ہے، اس قسم کی باتیں تشبیہ واستعارہ کے طور پر محض زور کلام قائم رکھنے کے لیئے کہی جاتی ہیں۔

دوسرا دھوکا ہمیں اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ فرد کے اعمال وافکار انفرادی واجتماعی حالت میں بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس لئے اجتماع فرد سے مختلف کوئی چیز ہے۔ یہ دلیل پیش کرنے والے منطقی مغالطہ دے رہے ہیں۔

اور کچھ نہیں۔ لیبان نے اس اختلاف کی وجہ یہ بتائی ہے کہ فرد جب کسی جم غفیر میں ہوتا ہے تو اس کو اپنی قوت اور طاقت کا ایک زبردست احساس پیدا ہو جاتا ہے اور عددی قوت کا احساس اور رہنما کا وجود اس کے اندر سے ذاتی ذمہ داری، اور شخصی تصورات کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک پرجوش اجتماعی ہمدردی پیدا کر دیتی ہے جس میں انفرادی خیال مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ ایک جماعتی جوش اور حوصلہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اسے کسی طرح ایک مختلف وجود نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک جم غفیر نے اُٹھ کوئی بڑا کام کر ڈالا۔ اس وقت تو اس کا احساس نہیں ہوتا لیکن دوسرے ہی دن اس جم غفیر کا ایک ایک آدمی اپنے کو اس عمل کا ذمہ دار سمجھتا ہے، وہ اس ذمہ داری کو کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔ اور ڈالے بھی تو کس پر ڈالے، وہاں ان افراد کے سوا اور کون تھا؟

تیسرا دھوکا تاریخ میں قوموں کے ذکر سے ہوتا ہے، تاریخ میں قوموں کا ذکر افراد کی طرح ہوتا ہے، جرمنی نے یہ کہا اور انگلستان یہ کہتا ہے، ہندوستان کی یہ رائے ہے وغیرہ وغیرہ، ہم چونکہ بچپن سے اس قسم کے بیانات تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں، اس لئے غلط فہمی ہوتی ہے کہ قومیں بھی اشخاص ہیں، اور واقعی طور پر ان کی کوئی حقیقت بھی ہے۔ ہم یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ سوسائٹی بڑھ کر قوم بنتی ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ افراد مل کر سوسائٹی بناتے ہیں۔

مندرجۂ بالا بیان سے یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ مملکت کی کوئی قدر وقیمت ہی نہیں ہے، اگرچہ مملکت کوئی عضویاتی نظام نہیں لیکن بہرحال یہ ایک نظام ہے اور نہایت زبردست نظام، اگر یہ نظام موجود نہ ہو تو

ایک مہذب آدمی کے لیئے زندگی دوبھر ہو جائے۔ اس کا افراد سے چولی دامن کا ساتھ ہے اگر نظام مملکت خراب ہوا تو افراد پر اس کا اثر پڑے گا اور اگر افراد خراب ہوئے تو پھر مملکت لازماً خراب ہو جائے گی۔

قوم اور قومی ادارے ایک دوسرے کے نتائج کی حیثیت رکھتے ہیں، زبان، قانون، اور رواج پچھلی نسلوں میں جس طرح بنتے رہے ہیں موجودہ نسل ہیں اسی طرح موجود ہیں، اور مستقبل کا نقشہ ان ہی سے بن کر تیار ہوگا۔ فرانس والوں ہی نے فرانس کو بنایا۔ اور فرانس ہی نے فرانس والوں کو تیار کیا ہے، کل کے فرانسیسی ہی تھے جنھوں نے آج کے فرانس کی تعمیر کی، اور آج کا فرانس فردا کے فرانسیسی کو بنائے گا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ فرانس والوں سے جدا کرکے فرانس ایک جغرافیائی حد بندی سے زیادہ کچھ نہیں ہے، بھیڑ نہیں تو گلہ بھی نہیں، چڑیا نہیں تو جھنڈ بھی نہیں اور سپاہی نہیں تو فوج بھی نہیں، بالکل اسی طرح اشخاص نہیں تو قوم و مملکت کچھ بھی نہیں، قوم و مملکت جماعت بندی کے ادبی نام ہیں، اور بس اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں، ہیگل کا نظریہ کوئی فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ علم الاصنام کا خرافی خیال ہے۔

فاسطیت اور نازیت کی دوسری بنیاد عسکریت ہے، اور ہیگل کا تصور مملکت اس عسکریت کی جان ہے۔ اس میں رہنمائی فرد واحد کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور وہ فرد واحد سارے اختیارات کا مرکز قرار پاتا ہے، اطالیہ اور جرمنی کی موجودہ قیادت پرانی شہنشاہیت کی ایک نئی شکل ہے جس میں سے توریث کا جزء خارج کر کے ساتھ ولیوں کے سایہ کا مکمل تصور باقی رکھا گیا ہے۔ بادشاہ کبھی غلطی نہ کرتا تھا، اب لیڈر کبھی غلطی نہیں کرتا، کیا فرق ہے؟

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملکی انتظامات میں آمریت سے ایسے بعض نمایاں فوائد حاصل ہوتے ہیں جن سے جمہوریت اکثر وقت خالی نظر آتی ہے، قوت کارکردگی، ضبط و نظم اور انتظامات میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نظم و نسق میں آراء کا اختلاف یقیناً ہوتا ہے، کونسلوں اور اسمبلیوں میں بحث و مباحثہ، افہام و تفہیم، رائے شماری اور آخری درجہ پر استصواب عامہ سے اس کا تصفیہ کیا جاتا ہے، آمری نظام میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور بہت نمایاں ہوتا ہے لیکن وہاں بجائے بحث و مباحثہ یا استصواب کی بجائے آمر کی رائے فیصلہ کن قرار دی جاتی ہے۔ اب اس کے بعد اختلاف کو بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ کچل دیا جاتا ہے۔ اختلاف کرنے والوں کو پھانسی، جلا وطنی، قید اور کم از کم اختیارات سے بے دخل کر دینے کی سزا دے دی جاتی ہے۔ خود آمر بھی تو آخر انسان ہی ہوتا ہے اس کی رائے کس طرح بنتی ہے، ایک جماعت اپنے اثرات اور اپنی چرب زبانی سے اس کو اپنا ہم نوا بنا لیتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھلے بحث و مباحثہ کی بجائے سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور کامیاب وہی رہتا ہے کہ جو سب سے اچھا سازشی ہو۔ تجربہ کار کاور نے کیا خوب کہا ہے کہ:۔

"بدترین ایوان بھی بہترین دربار سے بہتر ہوتا ہے"

آمریت کے حقیقی امتحان کا وقت اس وقت آتا ہے جب کہ پہلا آمر اپنی عمر کو ختم کر رہا ہو۔ شخصی حکومتوں کی تاریخ میں روما کا صرف ایک واقعہ ملتا ہے۔ جب کہ ایک کے بعد دوسرے نے اسی سال تک صحیح نظم و نسق کے ساتھ حکومت کو چلایا تھا ورنہ ایک آمر کے بعد دوسرا آمر کس طرح جانشین ہوتا ہے

اور اس کے کیا نتایج برآمد ہوتے ہیں ایک طویل داستان ہے جو سازشوں، اور داروگیر کے واقعات سے پُر ہے۔

شخصی آزادی کو آمر کے قدموں پر نثار کر دینا بڑی عظیم الشان قربانی ہے۔ ذرا جمہوری طریقۂ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے والے ایسی صورت حال کا تصور کریں، موت کا پسینہ آجائے گا، ذرا غور تو فرمائیے کہ ہمیں ایک خاص خیال کے مطابق خبریں، فلم، تعلیم اور تمام معلومات مہیّا کی جائیں، ہمارے بچّوں کی تعلیم کا مقصد عسکریت اور صرف عسکریت قرار پائے، ہماری آنکھیں، ہمارے کان اور ہمارے اعضا و جوارح شخص واحد کے افکار وخیالات کے تابع قرار دیئے جائیں، اور ہمیں مجبور کیا جائے کہ اسی کی آنکھوں سے دیکھیں اور اسی کے کانوں سے سُنیں، پھر اس سب کو حق سمجھیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آبادی نے مذکورہ بالا قربانی اپنے ارادہ اور اپنی خوشی سے کی ہے، اپنے ووٹ سے آمر منتخب کیا ہے، لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آمری انتخابات میں مخالفت کی اجازت نہیں دی جاتی تنقید ممنوع ہوتی ہے، اور ہر جائز و ناجائز تدبیر اتفاق رائے حاصل کرنے کے لیئے کی جاتی ہے —— یہ تو ہے آمری انتخابات کا حال لیکن فرض کر لیجیئے کہ ووٹ دینے کی پوری آزادی بھی حاصل ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فرد کو اس منتخب شخص کا دماغی اور جسمی غلام ہو جانا چاہیئے۔

انتخابات میں جو عوامل خارجی کام کرتے ہیں اُن سے کون نہیں واقف ہے؟ اور سب سے زیادہ مصیبت انگیز معاملہ تو ووٹ دینے کے بعد شخصی اختیارات کے مسلوب ہو جانے کا مسئلہ ہے، اگر کسی جماعت نے اپنی خدمت کے لیئے کسی شخص کو منتخب کیا چاہے وہ انتہائی جمہوری اُصول پر منتخب کیا گیا ہو،

پھر بھی سوال یہ ہے کہ جماعت اس ایک فرد کی رائے کی پابند کیوں بنائی جائے، اور کیا یہ جماعت پر ظلم نہ ہوگا۔) ایڈمنڈ ایبٹ نے کہا تھا کہ ایک فرانسیسی صبح کے وقت آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر اس لیے خوش ہوتا ہے کہ اُس نے سات کروڑ جابروں میں ایک کو دیکھا، یہ بھول جاتا ہے اس نے ایک مکمل غلام کو بھی دیکھا۔

اب فرض کر لیجئے کہ خدانخواستہ ہندوستان کے۔ اس وسیع براعظم میں ایک جمہوری مملکت قائم ہوگئی تو ہندوستانیوں کا کیا حال ہوگا۔ اسمبلیوں میں رائے عامہ کی جتنی اچھی نمائندگی ہوتی ہے، اس سے کون واقف نہیں، ووٹ کس طرح حاصل کئے جاتے ہیں، اس کی کسے خبر نہیں۔ اور پھر منتخب حضرات فرض ترجمانی کس خوبی ادا کرتے ہیں کیا آپ اس سے ناواقف ہیں؟ کیا اب اندازہ نہیں لگا سکتے کہ شخصی آزادی کا گلا کس طرح گھونٹ دیا جائے گا۔ اور "لیڈر آف دی پارٹی" کی رائے کے ساتھ پارلیمانی جماعتیں کس طرح طوطی صفت نظر آئیں گی، اس وقت ہندوستانی چند سو یا چند ہزار بے ایمان سازشیوں اور بدباطن افراد کا غلام نہ ہوگا، اور خود وہ افراد اپنے لیڈر کے پرستار نہ ہوں گے، انسانوں کو آزادی رائے کہاں تک میسر آسکے گی، دل خوش کن خواب دیکھنا اور بات ہے اور دانشمندوں کی طرح سوچنا اور بات، جمہوریت اپنی مکمل شکل میں بھی آمریت کی آلایشوں سے پاک نظر نہیں آتی، اور آمریت کا کیا کہنا کہ یہ تو چہرۂ انسانیت کا سب سے بدنما داغ ہے،

اس مسئلہ کا حل کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ ہر فرد اس ضابطہ کا ماتحت قرار دیا جائے جسے وہ یقین کے ساتھ لاہوتی سمجھتا ہو، اور ان افراد کی

آزاد رائے سے کسی ایک جماعت کو انتظام سپرد کر دیا جائے، جس پر ٹھیک وہی ضابطہ جاری ہو جو دوسرے تمام افراد پر جاری ہے، پھر یہ قصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ ع نے کوئی فغفور و خاقان نے فقیر رہ نشین۔

غرض کہ یہ مسئلہ چاہے اعلیٰ مسائل میں سے ہو یا ادنیٰ میں سے اصل معاملہ رہ جاتا ہے۔ خود اعتمادی اور آزادی روح کا۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ضمیر کی آواز کو انسانی حیات میں اہم ترین مرتبہ حاصل ہے۔ اور سب کچھ وجدان انفرادی پر منحصر ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اختیارات پر قبضہ کرے اور پھر انھیں جیسے چاہے استعمال کرے، اور جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ درست عمل بھی صرف اسی وقت درست قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ آزادی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو اور جن کے نزدیک کسی عظیم مملکت کا وجود عظیم الشان شہریوں کے وجود پر منحصر ہے۔ ایسے لوگ۔ ایک حاوی و ہمہ گیر حکومت کو بے راہ روی اور تمدن کی تباہی تک لے جانے والی راہ سمجھتے ہیں۔

فاسسطی و نازی طریقہ کا نمایاں عنصر یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے معاشی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اطالیہ میں اس نے ایک جامع و محکم مملکت کا نظریہ پیدا کر دیا۔ عام آبادی کی رائے سے منتخب کی ہوئی ہر مجلس مقننہ ختم کر دی گئی اور بہ ظاہر آزادی کا مقام خالی نظر نہ آنے کی غرض سے بعض عجیب مجالس بنائی گئیں ——— یہی وجہ ہے کہ حکومت کے متعلق یہ اصول قائم کر دیا گیا کہ حکومت مختلف جمعیتوں کا ایک وفاق ہے اور ہر جمعیتہ کسی ایک صنعت یا پیشہ والوں کی نمائندگی کرتی ہے، ان میں سے ہر ایک جمعیتہ اس صنعت یا پیشہ والوں کی

منتخب نمائندوں پر مشتمل ہے ـــــــ فاسطیت مارکسیت سے جہاں اور بہت سے نقاط میں متفق ہیں وہاں اس مسئلہ میں بھی دونوں کا ایک ہی نظریہ ہے۔ اشتمالیوں کا "مادی تصور تاریخ" ٹھیک وہی چیز ہے جس کا وجود فاسطی ہمہ گیر مملکت میں پایا جاتا ہے۔

یہ سیاست کا فریب ہے۔ زندگی عمل سے زیادہ بھی کچھ ہے، ایک شہری کسی پیشہ ور زیادہ بھی کچھ ہے، اور کون کہ سکتا ہے کہ انسانی تاریخ صرف مادیات کے باہمی تصادم کا نام ہے اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ـــــــ ہاں یہ صحیح ہے کہ معاشی عامل بھی تاریخ انسانی میں موجود ہے، اور یہ بھی غلط نہیں کہ ہر دور میں اسے اہمیت بھی حاصل رہی ہے اور کبھی کبھی تو محرک اول کا مقام بھی اسے مل گیا ہے، لیکن انسانی تاریخ کے ادوار کو محض مادیات کے تکوین کی تاریخ سمجھنا اور یہ یقین کر لینا کہ روحانی و عقلی امور سے حضرت آدمؑ کے اولاد کی پوری تاریخ خالی ہے ایک ایسا خیال ہے جو انتہائی ظاہر پرست دماغ ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک مجلس مقننہ بہت سے ایسے امور پر بھی غور کرتی ہے جس کا کوئی تعلق کسی خاص پیشہ سے نہیں ہوتا ـــــــ مثلاً تعلیمات اور دیگر ثقافتی امور، اصلاح معاشرت مالیات عامہ، امن، دفاع، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ ـــــــ کیا ایک رکن قانون ان امور پر غور کرتا اور اس کے عمل اس لیئے کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر، وکیل، تاجر، کارخانہ دار یا کسان ہے، نہیں ہرگز نہیں یہ وہ امور ہیں جن پر انسان صرف انسان ہونے کی وجہ سے غور کرتا ہے ـــ اس لیئے ایک ہمہ گیر جامع حکومت کا تصور بنیادی طور پر حماقت پر مبنی ہے۔

ذرا نازیت، فاسطیت اور مارکسیت کی تحلیل عقلی کر کے ان پر غور کیجئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی عالم انسانی کی آئندہ سیاسی ترقی کے لئے ضامن نہیں ہو سکتا۔ ذرا غور کیجئے خود آزادی کی چار قسمیں ہیں، اور ان کے دعاوی بھی مختلف ہیں۔ عہد حاضر میں ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ الجھاؤ قوت اور آزادی کے مابین نہیں ہے، بلکہ دو ایسی قوتوں کے مابین جنگ جاری ہے جو مختلف قسم آزادی کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں۔

ایک وطن پرست اپنے ملک کی آزادی اور خود مختاری کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اس مقصد کے لئے ممکن ہے کہ وہ عسکریت پر زور دے۔ ممکن ہے کہ جبری فوجی بھرتی جاری کرے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے آمریت کا ساتھ دے۔ ایک اشتمالی کا مقصد معاشی آزادی ہے، وہ چاہتا ہے کہ مزدوروں کو کارخانہ داروں کی غلامی سے نجات دلائے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اس مقصد کے حصول کے لئے عسکریت پسند ہو جائے۔ جبری فوجی بھرتی پر اصرار کرے، اور آمریت کا بھی ساتھ دے۔ اسی طرح ایک جمہوریت پسند شخصی و سیاسی آزادی کو نصب العین قرار دے کر ان تمام امور کو ضروری سمجھے، وطن کی حفاظت اور معاشی آزادی کے لئے وہ بھی عسکریت اور جبری فوجی خدمت کی حمایت کر سکتا ہے — غرض کہ یہ تینوں آزادی کے مختلف پہلوؤں کی حمایت کرتے ہیں۔ اور آپس میں ان کا خونیں مقابلہ بھی ہو جاتا ہے — دور جدید کا سیاسی الجھاؤ درحقیقت یہ اور اسی قسم کے مختلف مقاصد کے حصول کی جد و جہد کا خونیں مقابلہ ہے —

انیسویں صدی میں خیال کیا جاتا تھا کہ آزادی ایک بسیط چیز ہے اختلاف

آزادی خواہوں، اور آزادی سے محروم کرنے والوں میں تھا، لیکن بیسویں صدی میں فوجی بھرتی ہوتی ہے جھگڑے ہوتے ہیں، جنگیں ہوتی ہیں اور دونوں فریق آزادی کے کسی نہ کسی پہلو کی حمایت میں جانیں لڑا دیتے ہیں۔ مقابلہ آزادی خواہوں، اور آزادی سے محروم کرنے والوں کے مابین نہیں بلکہ دو آزادی خواہوں کے مابین ہے۔ اب ضرورت ہے ایک قسم کی آزادی کے لیے دوسری قسم کی آزادی کو کلاً یا جزاً ختم کر دیا جائے۔

بہ ظاہر یہ بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے، اور حقیقتہً بھی یہ کام کچھ زیادہ آسان نہیں لیکن ضرورت بہر حال اس کی داعی ہے شخصی آزادی کی بڑھتی ہوئی مقدار اگر حکومت کو کمزور کر رہی ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ ایسی آزادی کو ختم کر دے بلکہ خود باشندوں کا فرض ہے کہ بہ رضا و رغبت یہ قربانی کریں۔ ہاں البتہ ضروری ہے کہ اس قدر عظیم الشان قربانی سے پہلے انھیں واضح طور پر وہ چیز معلوم ہو جائے جس کے حصول کے لئے انھیں اپنی شخصی آزادی کو قربان کرنا پڑے گا بالکل اسی طرح اگر شخصی آزادی مقصود ہے تو معاشی آزادی کے بعض اجزاء کو قربان کر دینا پڑیگا۔ غرض کہ آزادی کے مختلف پہلوؤں میں توازن کے قیام پر ہی نوع انسان کی سعادت کا دار و مدار ہے بعض پہلو پر اتنا زور دینا کہ دوسرے تمام پہلو متاثر ہو جائیں ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کا خمیازہ موجودہ عصر کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

تیرھواں باب

قومیت اور انسانیت

قومیت اور انسانیت

جب ہم بین الاقوامی تعلقات کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہ تاریک کہر میں چل رہے ہوں، کوئی چیز اپنی حقیقی شکل میں دکھائی نہیں دیتی، یا یوں سمجھئے انسان اس دنیا میں کسی چیز کو حقیقۃً دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ فلسفیوں، مورخوں اور شاعروں نے نسلوں سے جادو بیانی کا وہ کہر پیدا کر دیا ہے کہ سب کچھ اس میں نہاں ہو جاتا ہے یہاں پر خیالات کا مُسافر راہ بھول جاتا ہے۔ کتابوں اور تقریروں میں ان معاملات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے انسانی عمل سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو بلکہ یہ سب کچھ کسی نادیدہ طاقت کے ماتحت بغیر انسانی ہاتھوں کے ہو رہا ہے۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں علت و معلول کا ایک مربوط سلسلہ جاری ہے۔ تمام قومی و بین الاقوامی معاملات، اور واقعات و حوادث فرد کے اعمال یا فیصلہ کے لازمی اثرات ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت جب واضح ہو جائے تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ مملکتی اخلاق اور شخصی اخلاق کے مابین تفریق نہیں کی جا سکتی۔

ہیگل کا تصور مملکت اخلاقیات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے، اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مملکت تمام قسم کی روایاتی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔

لیکن اس اصول پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکتی اخلاق کی عدم موجودگی میں شخصی اخلاق اور اسی طرح شخصی اخلاق کی عدم موجودگی میں مملکتی اخلاق خود بخود غائب ہو جاتے ہیں۔ مملکتی اخلاق کیا چیز ہے؟ ــ شخصی اخلاق کی اجتماعی تشکل ــــ اگر کسی شخص کے لئے ہمسایہ پر قاتلانہ حملہ کرنا بری بات ہے تو کسی ایک مملکت کے ماتحت زندگی بسر کرنے والے کروڑوں انسانوں کے لئے ہمسایہ ملک کے کروڑوں انسانوں پر قاتلانہ حملہ کرنا کس طرح جائز ہو جائے گا۔

موجودہ عصر کی تباہ حالی نتیجہ ہے اس غلط خیال کے عام ہو جانے کا کہ انفرادی طور پر جو کام برا ہو، اگر قومی نقطۂ نظر سے صحیح قرار پائے تو اسے "حقیقت پسندی" کہا جائے گا، ایک بار اس "حقیقت پسندی" کو جائز قرار دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہر طرح کی برائی کا دروازہ کھل جاتا ہے جسے بند کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

قرون وسطیٰ میں ہر طرح کی ذمہ داری شخص واحد یعنی بادشاہ پر عائد ہوتی تھی، ہزاروں برائیوں کے باوجود بادشاہ ایک انسانی دل رکھتا تھا، مذہب، اخلاق، آخرت کی جزا و سزا کا تصور بڑی حد تک اس کے اعمال کو اعتدال کے حدود میں رکھتے تھے ــ اگرچہ یہ غلط نہیں کہ بادشاہ اکثر بڑے اعمال کے مرتکب بھی ہوتے تھے، اور ان کا نقصان بھی ملک کو برداشت کرنا پڑتا تھا لیکن مذہبی فرائض کی پابندیاں ایسے غلط کار بادشاہوں اور امراء سے بھی بہت سے اچھے اعمال کرا لیتی تھیں ــــــــ موجودہ زمانہ میں مملکتی ذمہ داریاں اس قدر منقسم و منتشر ہو گئی ہیں کہ اگر انفرادی ذمہ داری اور انفرادی اخلاق کا تصور پوری قوت کے ساتھ پیدا نہیں کیا گیا تو انسانوں سے بھری ہوئی یہ دنیا چین و سکون کے لئے ترس جائے گی ــــ ایسے ماوراء انسانیت سیاسی تصورات کو جو فرد کو اپنے اعمال کا تمام تر ذمہ دار قرار نہ دیں ٹھکرا دینا اس

مقصد کے لئے ضروری ہے۔

تاریخ کو اسپنگلر کی زبان میں ایک شاعرانہ بیان کہیئے لیکن تاریخ صرف شاعرانہ بیان ہی نہیں بلکہ اس کا علمی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ تاریخ ہی سے ہمارے ادب میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ ایک ایسا ڈرامہ ہے جس کے کردار حقیقتہً اشخاص تھے۔ تاریخ نے ہی ہمارے لئے فقراء اور صوفیا کی شکل میں پرجوش ہمدردی کا نمونہ اور انسانی جذبات سے مملو کردار پیش کئے ہیں۔ تاریخ انسانی تجربات کی بہترین یادداشت ہے جس سے ماہرین سیاست، معاشیات اور اخلاقیات کے علماء سبق حاصل کرتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ سے ہم مستقبل کے لئے بہت کچھ سیکھتے ہیں، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ تاریخ فلسفہ کی وہ تعلیم جو مثالیں پیش کرکے دی جاتی ہے۔

تاریخی یادداشتوں کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تاریخ یقیناً اپنے آپ کو لوٹاتی رہتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ حالات ٹھیک وہی ہوں جو پہلی صورت میں تھے۔ مستقبل کا مطالعہ ماضی کی عینک سے نہیں کیا جاسکتا ——— کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ تاریخ اور اجتماعیات کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ بغیر اجتماعیات کے محض افسانہ ہے، اور اجتماعیات بغیر تاریخ کے محض دماغی پرواز۔ فن اخلاقیات میں بھی مختلف ادوار میں انسانی فلاح وبہبود کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے، اور جن اعمال سے انسانی فلاح کو نقصان پہنچا ہے اس سے الگ ہوکر نہیں رہ سکتا۔

اس لئے ماضی کی صحیح اور کامل یادداشت کا محفوظ رکھنا موجودہ اور آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے ضروری ہے۔ صحیح اور غیر جانبدار تاریخ کے بغیر آنیوالی نسلوں کو نہیں معلوم ہوسکتا کہ انسانی تجربات نے حقیقتہً کیا نتائج پیدا کئے

—— جو لوگ عمداً کسی سیاسی مصلحت یا مذہبی تعصب کی وجہ سے غلط تاریخ لکھتے اور اسکولوں میں پڑھاتے ہیں وہ حقیقۃً بنی نوع انسان پر اتنا بڑا ظلم کرتے ہیں جس سے بڑا ظلم کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ غلط تاریخ سے آنیوالی نسلیں غلط فیصلوں تک پہنچیں گی اور غلط فیصلوں سے غلط حکمت عملی تیار ہو گی۔ کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ غلط حکمت عملی کے کس قدر تباہ کن نتایج انسانی نسل کو برداشت کرنے پڑیں گے؟

چونکہ قومی اخلاق شخصی اخلاق کی اجتماعی شکل سے زیادہ کچھ بھی نہیں اس لئے قومی اخلاق میں بھی اسی روح کو کارفرما ہونا چاہیئے جس کا انفرادی و شخصی اخلاق میں پایا جانا ضروری ہے، خود غرضی اور ایثار کا صحیح توازن اس میں بھی ضروری ہے۔ کسی شخص پر اگر ہمسایہ کے حقوق واجب ہیں، اور اپنی فکر کرنا بھی لازم ہے تو کسی قوم کے لئے بھی ہمسایہ کے حقوق اور اپنی فکر دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

انسانوں کو لڑنے والا جانور کہنا، اور اس طرح جنگ کو فطرت انسانی کا خاصہ قرار دینا درست نہیں ہو سکتا۔ انسانوں کا وہ گروہ جو روشن دماغ ہے ایسے نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جنگ نہ ہو، کیا یہ واقعہ نہیں کہ دنیا کی ۶۸ حکومتوں میں سے ۶۳ حکومتوں نے میثاق کیلاگ پر دستخط کر دئے تھے۔ کیا یہ انسان کی تمنا نہیں ہے کہ جنگ کی مصیبت اس پر نازل نہ ہو —— ہاں یہ صحیح ہے کہ میثاق کیلاگ اور فرماں روایان عالم کے مشہور اعلان کے بعد بھی جنگ ختم نہیں ہو گئی، لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا نوجوانوں کی غلط تربیت، اور جذباتی و وجدانی سیاست کی وجہ سے۔

چودھواں باب

شرائطِ امن

شرایط امن

وطن[1] دوستی کو مٹا کر امن قایم کرنے کی کوشش صحیح طریقہ عمل نہیں۔ وطن دوستی کو امن عامہ کے خلاف ہا ور کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے ملک سے محبت کرتا ہے تو اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کی دشمنی ہو۔ چونکہ وطن دوستی کے ماتحت انسان دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے کوشش کرتا ہے، اس لئے خطرہ ہے کہ اگر وطن دوستی کو ختم کر دیا گیا تو بنی نوع انسان کے لئے ایسا کرنا مضر ثابت ہوگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگوں کے

---

[1] فاضل مصنف کا یہ خیال درست ہے کہ وطن دوستی کو ختم کر کے امن قایم کرنا مفید نہیں، لیکن وطن دوستی کی وہ شکل جو موجودہ صدی میں پائی جاتی ہے وہ وطنیت ہے، اور اکثر ملکوں میں تو یہ وطنیت انتقامی و ہجومی وطنیت بن گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ موجودہ بے چینی اور خطرناک صورت حال ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وطن کے تصور کو پوری کوشش کے ساتھ مٹا دیا جائے تاکہ انسانوں کی یہ ناپاک تقسیم باقی نہ رہے، رہا کسی شخص کا اپنے ملک کی فلاح کے لئے کوشش کرنا، تو یہ عام انسانی جذبہ ہے، باقی رہے گا۔ اور بغیر دوسروں کو نقصان پہنچائے فائدہ پہنچاتا رہے گا (ہاشمی)

قلوب میں یہ حقیقت راسخ کردی جائے کہ امن عامہ خود بھی وطن دوستی کا لازمی جزو ہے۔ اعلیٰ تہذیب کا عام فلاح نوع انسانی پر انحصار ہے۔ کوئی ملک خوش حال صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دنیا بحیثیت مجموعی خوشحال ہو ـــ خود غرضی چاہے فرد کی ہو یا ملک و قوم کی دنیا کے لئے ضرر رساں ہے ـــ جو ملک بے رحمی کے ساتھ دوسرے کو کچلنے کی سعی کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے خلاف عام دشمنی پیدا کرتا ہے ـــ صحیح وطن دوست وہ ہے جو اپنے ملک کے لئے دوست پیدا کرے نہ کہ وہ جو دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کا موجب ہو۔

تجربہ بتاتا ہے کہ امن عالم کے لئے تین لازمی شرائط ہیں جب تک یہ تینوں شرائط بدرجۂ کمال موجود نہ ہوں، اور جب تک ان تینوں کی انتہائی احتیاط کے ساتھ حفاظت نہ کی جائے امن عالم قائم نہیں رہ سکتا بلکہ جنگوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور نوع انسانی پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے رہیں گے۔

پہلی شرط:۔ امن عالم کی اولین شرط بین الاقوامی انصاف ہے، عدلیہ میں دنیا کے چھوٹے بڑے تمام ممالک کو یکساں اور مساوی درجہ ملنا چاہیئے۔ چین کا یہ قول کہ ہر آزاد قوم چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی بین الاقوامی قانون کی نظر میں برابر درجہ رکھتی ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے نہایت مفید اور حق تو یہ ہے کہ تمام بین الاقوامی قوانین کی روح ہے ـــ بڑی بڑی مملکتوں کو دنیا کے معاملات میں اپنی آبادی اور اپنے ذرائع کے بموجب نسبتہً زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہوگا، لیکن قانون کی نظر میں بالکل اسی طرح جیسے عدالتوں میں غریب امیر اور شریف و کمینہ برابر ہوتا ہے چھوٹے اور بڑے ممالک اگر برابر نہ رہیں گے تو انصاف کا خون ہو جائے گا، اور دوامی خطرہ پیدا ہو کر

دنیا کے امن وسکون کو ختم کردے گا۔

دوسری شرط:۔ کوئی مملکت دوسری مملکت کے اندرونی معاملہ میں دخل نہ دے، یہ شرط بھی درحقیقت افراد کے مسلمہ قواعد کی مملکتوں کے لئے پابندی ہے۔ افراد کے لئے ضروری ہے کہ ہمسایہ کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں بشرطیکہ ہمسایہ کا طریقۂ عمل خود اس کے لئے تکلیف دہ اور ناقابل برداشت نہ ہوجائے بالکل اسی طرح ممالک کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنے خاص خیالات کا دوسرے ممالک کو پابند کرنے کی سعی نہ کریں اور نہ کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوں۔

نمونہ کا موجود ہونا اور کسی خاص طریقۂ حکومت کی کامیابی خود بخود اثر کرتی رہے گی، مثلاً جمہوری طریقۂ حکومت کی کامیابی یا ناکامی خود بخود دوسرے ممالک کو متاثر کرے گی، اس قدر اثر اندازی تو نہ صرف درست بلکہ ازبس ضروری ہے تاکہ نوع انسانی مختلف تجربات سے گزر کر زیادہ فلاح بخش طریقہ تک پہنچ سکے۔ لیکن جب سیاسی پروپیگنڈہ ارادی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی ملک میں دوسرے ملک کی طرف سے شروع کیا جاتا ہے تو ناقابل برداشت ہوجاتا ہے ــــ یہ شکل درحقیقت ایک قسم کا حملہ ہے، فوجی نہیں، ایجنٹوں اور ادبیات کے ذریعہ۔

محفوظ اور منصفانہ طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر ملک کے بسنے والوں کو اس ملک کا تمام تر ذمہ دار سمجھا جائے۔ انھیں اختیار حاصل ہے کہ اگر اپنے لئے جمہوریت کی بجائے نازیت، فاسطیت یا کوئی اور طریقۂ حکومت پسند کریں تو اختیار کرلیں، کسی دوسرے ملک کو اس معاملہ میں دخل دینے کا حق نہیں۔ جب طریقۂ حکومت کے انتخاب میں خرابی نظر آئے گی تو اس ملک کے

بسنے والے خود اپنی ذمہ داری پر اُس طریقہ کو بدل کر دوسرا طریقہ اختیار کرلیں گے، ہمسایہ ممالک کو صرف دیکھنے اور اُن کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے ـــــ اور یہ حق حاصل ہے کہ دوسروں سے اپنے اسی حق کا مطالبہ کریں اور کہہ دیں کہ تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو۔

تیسری شرط:- معاہدات کی پابندی،

جس طرح افراد ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ کی پرسکون زندگی صرف اسی وقت بسر کرتے ہیں جب ایک کے قول، وعدہ اور میثاق کا دوسرے کو اعتبار ہو، بالکل اسی طرح اقوام کی زندگی بھی ہے۔ جب تک یہ کہا جاتا رہے گا کہ "معاہدات کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزہ سے زیادہ کچھ نہیں" کس طرح یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ امن عالم قایم ہو سکے گا۔

ہمارے عہد کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ بین الاقوامی معاہدات کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی، قومی اعتبار جاتا رہا، اور عام احساس عدم تحفظ نے فوجی طاقت کے بڑھانے کا خبط پیدا کر دیا۔ نتیجہ اس کا جو نکل سکتا تھا، نکلا اور بے چینی بڑھتی رہی ـــــ خود معاہدات کی ترتیب میں بین الاقوامی مساوات کا زرین اصول توڑ دیا گیا تھا۔ اس لئے معاہدات سے بے چینی کم نہ ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی ـــــ ایک تو آبادی ہی کے مسئلہ کو لیجئے ـــــ تقسیم اس طرح عمل میں آئی کہ دنیا کا ⅔ دو تہائی حصہ آٹھ سلطنتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ باقی ایک تہائی ⅓ ساٹھ سلطنتوں کے لئے رہ گیا ـــــ جاپان کے قبضہ منچوریا اور ایطالیہ کے قبضہ حبشہ کو چھوڑ کر دیکھئے تو تقسیم حسب ذیل ہوتی ہے:-

(۱) برطانیہ	۱۲،۴۰۰،۰۰۰	مربع میل
(۲) روس	۸،۲۵۰،۰۰۰	"

(۳) فرانس	۴۳۵۰۰۰۰	مربع میل
(۴) چین	۴۲۵۰۰۰۰	"
(۵) ممالک متحدہ امریکہ	۳۷۵۰۰۰۰	"
(۶) بلجیم	۹۳۰۰۰۰	"
(۷) پرتگال	۸۵۰۰۰۰	"
(۸) ہالینڈ	۸۰۰۰۰	"
	۳۷۱۸۰۰۰۰	

ساری دنیا کا رقبہ خشکی پانچ کروڑ پچپن لاکھ، منچوریا ۳۶۳۰۰۰، اور حبشہ ۳۵۰۰۰۰۔

جب تقسیم اس قدر غیر منصفانہ ہو تو کون اُمید کر سکتا ہے کہ آئندہ امن قائم رہے گا۔ بین الاقوامی مساوات کا اُصول توڑ دیا گیا، اور معاہدات کا احترام بھی اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔

ایسے موقع پر پھر مذہب کی مقدس طاقت اور پاک اثرات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، قومیت کا طوفان۔ اور قومیت کی خود غرضیوں کو اعتدال پر لانے کی کوئی سبیل مذہب کے سوا نہیں ہو سکتی، مذہب قومیت کی بجائے بین الاقوامیت اور وطنیت کی بجائے انسانیت اور انسانی جذبہ ہمدردی پر اصرار کر کے ہمارے دماغوں میں اعتدال اور قلوب میں صفائی پیدا کرتا ہے۔

پندرھواں باب

عمل

عمل

اگر عصر حاضر کے بسنے والے چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل کی طرف جو قدم اُٹھے وہ صحیح بصیرت اور یقین کے ساتھ اُٹھے تو ضروری ہے کہ پہلے وہ اس ذہنی کہرے سے باہر نکل آئیں جس نے ان کو انتشار دماغی میں مبتلا کر رکھا ہے،
چاہیئے کہ مذہب ان طبعی حقایق کو قبول کر لے جسے موجودہ علوم نے مسلم قرار دیا ہے خواہ مخواہ فرسودہ خیالی کو سائنس سے نہیں ٹکرانا چاہیئے۔ جب کہ خود سائنس بھی ایک ایسے عالم کو ہماری آنکھوں کے سامنے منکشف کر رہا ہے جس میں خداوند تعالیٰ کی عظمت موجود ہے اور اسی کا جلال پوری طرح چمک رہا ہے۔
اسی طرح مذہب اور سائنس دونوں کو چاہیئے کہ دنیا میں شر کے وجود کو تسلیم کریں۔ دنیا کے طبعی انقلابات اور انسان کے اختیار عمل کا لازمی نتیجہ شر کا وجود ہے۔ ایک جامد کائنات تو شر سے خالی ہو سکتی ہے۔ کوئی خاص نسل جس کی صحیح نگرانی کی جائے وہ بھی وجود شر سے خالی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسی دنیا جس میں حدوث و تبدل کا عمل جاری ہو اور وہ انسان جس میں اختیار عمل اور قوت تمیز موجود ہو کبھی شر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہم انتخاب عمل میں انفرادی و اجتماعی غلطیاں کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ ہاں! یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر شر کے اندر بھلائی کی ایک امید پوشیدہ ہے۔ کیونکہ عمل حدوث جاری ہے اور

انسان عمل کے انتخاب کا اختیار رکھتا ہے اس لیے انسان کو یہ موقع حاصل ہے کہ شر سے محفوظ رہے۔ اور اکثر صورتوں میں وہ اس موقع و اختیار سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ قنوطیت درحقیقت ایک نہایت برا فلسفہ ہے۔

فردِ انسانی اپنی ذمہ داری کو قضاء بلکہ خدا پر بھی نہیں ڈال سکتا۔ قضاء ایک اختراعی چیز ہے۔ آسمانی موثرات عالم جیسا کہ افلاطون پیش کرتا ہے انسان کو پست کر دینے والی چیز نہیں بلکہ باعث ترغیب ہے۔ اگر خدا ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں آشکارا طور پر فعال نظر آتا تو انسان ہستی مجہول ہو کر رہ جاتا، لیکن خدا مخفی ہے اس لیے انسانی عمل کے واسطے میدان کھلا ہوا ہے)

یہ یقین رکھنا کہ سلسلۂ ارتقاء انسانی ترقی کی ضمانت ہے۔ ایک فریب نظر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ رجائیت ہے اور ویسی ہی غلط بنیادوں پر قایم ہے جیسی بنیادوں پر قنوطیت قائم ہے۔ ہم سال بسال حالات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ترقی پذیر ہے۔ لیکن دہائیوں اور صدیوں پر غور کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی حالات جہاں تھے وہیں ہیں، بلکہ اور تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ترقی خود بخود نہیں ہوا کرتی، بلکہ عادتاً محتاج ہوتی ہے عمل کی، البتہ یہ خیال درست نہ ہوگا کہ ایسی امید محض ایک سراب ہے یا ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔

(سب کچھ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے، اس لیے ساری اہمیت عمل کو حاصل ہے، لیکن ہر عمل کو نہیں وہ عمل نہ قابل تعریف ہے اور نہ اُسے کوئی اہمیت حاصل ہے جو نصب العین اور طریقۂ عمل متعین کیے بغیر کیا جائے۔ عمل صرف عمل کے لیے، آرٹ محض آرٹ کے لیے، یا حرکت صرف حرکت کے لیے وہ جنونی خیالات ہیں جو انسانی زندگی کو گھٹا کر محض ایک قمار بازی

مرتبہ میں پہنچا دیتے ہیں ـــــ حرکت محض حرکت کی خاطر بغیر یہ سوچے کہ کس رُخ کی طرف اور کیوں حرکت کی جائے، یا تیز سے تیز رفتار میں بڑھنا بغیر اس کا تعین کیے ہوئے کہ اس رفتار کا کیا مقصد ہے، یا مقصد ہی یہ تعین کر لینا کہ قوی تر اور فتح مند ہونا ضروری ہے اور اس سے بے خبر ہو جانا کہ یہ رفتار درست بھی ہے یا نہیں (ایک ایسا عقیدہ و ایمان ہے جو کسی کو بیہودگی اور چھچھورا پن تک پہنچا دیتا ہے اور کسی کو جذبات پرستی، تشدد اور جنگ تک پہنچاتا ہے پھر نتیجہ کیا نکلتا ہے، تباہی، ویرانی اور بربادی۔)

کہا جاتا ہے کہ پچھلے پاؤں چل کر کوئی شخص مستقبل کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ایک زمانہ تھا جب کہ لوگ اس سعی میں مبتلا تھے۔ بدامنی کے زمانہ سے لے کر اٹھارہویں صدی کے اختتام تک مغربی افکار کے رہنما رہبری کے لیے یونان و روما کی طرف نظر اٹھاتے تھے ـــــ جہاں کہیں مذہبی اجارہ داری ہو گی زندگی قدامت پرست ہو جائے گی ہر اچھے اور ترقی یافتہ دماغ کو یادِ دیرو زہ میں مبتلا کر دیا جائے گا ـــــ بلاشبہ ہمیں ماضی کے علوم، ماضی کے تجربات، ماضی کی تیقنات کی حاجت ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کہ مذہب اور مذہب کی تاریخ دونوں کو ایک قرار دیا جائے، فلسفہ اور پرانے فلسفیوں کے خیالات کو ایک سمجھا جائے، یا خیالات و افکار کو قدیم علماء کے افکار و خیالات کا پابند بنا دیا جائے۔

عصرِ حاضر کو موقع دیجیے کہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ عمل کرے۔ عصرِ حاضر میں حوصلہ کی پستی بہت نمایاں ہے۔ جنگوں سے شرما کر واقعات و حوادث پر نظر کر کے، اپنی وحشت و بربریت کو پہچان کر عصرِ حاضر۔ اب تیار ہے کہ اپنے کو مجرم قرار دے، صورت یہ ہے کہ ایک معاشی جب کہتا ہے کہ صرف مادی

ذرائع قابلِ اعتبار ہیں تو ہم سب مادہ پرست ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں، ایک ماہر نفسیات فطری و سادہ جذبات کی پرورش پر زور دیتا ہے تو ہم ابتدائی دور کے خیالات اور ان ہی افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایک ڈکٹیٹر اعلان کرتا ہے (ہم اس قابل نہیں رہے کہ اپنے اوپر آپ حکمرانی کر سکیں تو ہمیں اپنے اصول جمہوریت میں لاکھوں خرابیاں نظر آنے لگتی ہیں لیکن اس وقت اس کی خوبیوں سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

آئندہ آنے والا زمانہ شاید اس سے مختلف فیصلہ صادر کرے، بالکل ممکن ہے کہ ہماری حالت موجودہ حالت سے بہت بہتر ہو جائے۔ ممکن ہے تعلیم عام ہو جائے، غربت و فاقہ کشی سے نجات مل جائے سائنس کے کمالات سے استفادہ عام پوری طرح ہونے لگے۔ لیکن بہر حال ہمارے لئے مستقبل کے خوش آئند خوابوں میں زندگی بسر کرنا مناسب نہیں۔

"حق یہ ہے کہ ماضی یا مستقبل بیچارے حال سے کچھ زیادہ اسرار کے حامل نہیں ہیں"

نصب العین فلاح نوع انسانی ہے۔ اور فلاح کا انحصار کسی ایک ہی چیز کے حصول پر نہیں ہے۔ وجدان تمناؤں کی طرف متوجہ کرتا ہے، عقلیت اس کو بہتر یا بدتر قرار دیتی ہے، صفائی اور وسعت بخشتی ہے تجربہ بتلاتا ہے کہ فلاح کے واسطے کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیئے۔ مثال مباحثہ، قانون اور ضوابط نتائج کو روشن تر بناتے اور عمل کی راہ بتاتے ہیں ــــ اس طرح نسلوں اور صدیوں کی متواتر محنت و کاوش ــــ سے فلاح کا ایک مرکب تصور بن کر تیار ہوا ہے جس میں بہت سے اجزاء داخل ہیں ــــ اس فلاح میں روحانی، دماغی اخلاقی، مادی، اجتماعی اور

انفرادی سب ہی قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔

یہ ہے حقیقی بھلائی جس کی تلاش انسان کا فریضہ ہے۔ عمل درست ہے یا نادرست اس کا فیصلہ نتیجہ پر چھوڑ دیئے۔ نتیجہ چاہے عمل کا براہ راست نتیجہ ہو یا بالواسطہ، اسی طرح ممکن ہے کہ نتیجہ فوراً برآمد ہونے والا ہو یا بہت دیر کے بعد۔ بہرحال دیکھنا یہ چاہیئے کہ نتیجہ فلاح انسانی کے لئے مفید ہے یا نہیں

اس طرح ہم عقائد و فلسفہ کی بلندیوں سے اتر کر عمل کی شاہراہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ واقعات کو خیالات و افکار کی شکل میں بدل دینا ادب دانشا پردازی ہے اور خیالات و افکار کو واقعات کی صورت میں لانا سیاست ہے۔

عمل انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ سیاسیات میں ہمارے سامنے افراد بھی ہیں اور فرقے بھی، قومیں بھی ہیں اور ساری دنیا بھی، لازماً ان میں سے ہر ایک کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے، اور نہایت اہم اثر پڑتا ہے ــــــ اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے سیاسی ادارے اور ہمارا صنعتی نظام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ تصور صحیح نہیں کہ فرد کو اجتماع میں خاص اہمیت حاصل نہیں، افراد ہی کے مجموعہ کا نام اجتماع ہے، حکومت کا افراد رعایا پر دارومدار ہے، کارخانہ کا منیجر اور کاریگر دل پر، بڑے بڑے نام آور زعماء اور عملی اشخاص چاہے ان کی کتنی ہی زیادہ اہمیت ہو، بہرحال افراد ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح خود ان زعماء کی کامیابی کا دارومدار بھی ان کے متبعین پر ہوتا ہے، یہ افراد ہی ہوتے ہیں جن سے انبوہ بن کر تیار ہوتا ہے۔ اگر افراد دانش و فراست سے معرا ہوئے تو غلط اندیش زعماء قابو پالیں گے اور اچھے سے اچھا لیڈر قوت و طاقت سے خالی نظر آئے گا۔

فلاح نوع انسانی نصب العین ہے، انفرادی اعمال اس کے حصول کے ذرائع ہیں، اور آزادی اس کے حصول کی ایک شرط ہے۔ آزادی خود اپنی جگہ پر کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ آزادی کے لئے جان دینے کو تیار ہیں، شاید ان کا مقصد اس جملہ سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کے حصول کی خاطر جان دینے کو تیار ہیں جن کا حصول آزادی ہی میں ممکن ہے۔ خود آزادی تو ایک سلبی تصور سے زیادہ کچھ بھی نہیں، ۔ آزادی کا عام مفہوم یہ ہے کہ

"اجنبی حکومت نہ ہو، اندرونی جبر و تعدی نہ ہو، ظالمانہ قانون نہ ہو، لازمی افلاس نہ ہو"

غرض کہ عوایق و موانع کا ارتفاع مقصود ہے، اچھا! جب یہ سب کچھ ہو چکا، اور رکاوٹیں ختم ہو چکیں تو پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ خود آزادی کا حصول تو آخری نصب العین نہیں ہو سکتا، اسی کے ساتھ سب کچھ حاصل تو نہیں ہو جاتا۔ اس سے تو صرف ایک دروازہ کھل سکتا ہے، اس دروازہ کے باہر کیا ہے، یہ خود اپنی جگہ پر تصفیہ طلب رہ جاتا ہے۔

اسی طرح امن بھی حقیقتاً کوئی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی کسی عظیم مقصد کے حصول کی شرط قرار پا سکتی ہے اور نصب العین یقیناً سلبی نہیں بلکہ ایجابی ہوگا۔ جب امن اور آزادی کی ضمانت ہو جائے تو فرد کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع مل جاتا ہے اور دوسرے افراد کے تعاون سے ایک اعلیٰ درجہ کا اجتماع پیدا کرتا ہے اب اس وقت اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ عمل سے کیا فائدہ ہوگا۔ اجتماع میں فوائد عمل نمایاں نظر آئیں گے۔ ہر زمانہ کے لوگ اپنے زمانہ کو بے مثال اور عجیب زمانہ سمجھتے رہے ہیں،

لیکن ہمارا زمانہ حقیقۃً ایک بے مثال اور عجیب زمانہ ہے۔ آج تک انقلاب غیر شعوری طور پر ہوتے رہے ہیں، حیوان تو حیوان خود انسان کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ پچھلے حالات اور ماحول کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ——— لیکن آج کل ——— کرۂ ارضی کی لاکھوں سال کی زندگی میں پہلی بار اس خاکستری کرہ پر ایک ایسی نسل ظاہر ہوئی ہے جس نے کائنات پر حکمرانی کرنیوالے عوامل کے کسی نہ کسی قدر حصہ کو اپنے حیطہ اقتدار میں لے لیا ہے ـــ پچھلی تاریخ پر نظر ڈال کر وہ سمجھ گئی ہے کہ یہ نسل خود بھی پچھلے عوامل کا نتیجہ ہے، اور اس قابل ہے کہ ان عوامل کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔ آج کل کے لوگ اپنے ماحول کو معتدل بنا سکتے ہیں، اپنی تہذیب کو بدل سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ بے سمجھے نہیں بلکہ بالارادہ ایک متعین مقصد کو سامنے رکھ کر سکتے ہیں۔ آئندہ کا انسان وہی ہوگا جس کے پیدا کرنے کی موجودہ انسان سعی کرے۔ ذہنی انقلاب ہمارے دور میں اصول عمل بن چکا ہے۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھئے۔ اور فرض کر لیجئے کہ آپ کرۂ ارضی سے بلند فضاء آسمانی میں کسی طرح ٹھیر کر دنیا کو دیکھ رہے ہیں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح معاملات ہو رہے ہیں، کیا کیا بن رہا ہے، اور کس طرح یہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔

اس کے بعد ذہن کی آنکھ کو آج سے صدیوں پہلے کے تاریخی دور کا مطالعہ کرنے دیجئے، غور سے دیکھئے آج اس کرۂ ارضی پر بسنے والے دو ارب انسانوں کے آباء و اجداد کو، ان کے مکانات، ان کے حالات، ان کی نسلیں، ان کی حکومتیں اور ان کے عقاید کو غور سے دیکھئے، لیجئے دوسرا نقشہ سامنے آیا۔ اب غاروں، اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کی بجائے اونچے اونچے

منارے، مساجد گرجا، اور مندر نظر آنے لگے، انسانی مسلسل عمل کی نشانیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ ہماہمی اور وہ دلچسپیاں جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں موجود تھیں، ایک ایک کر کے سامنے آ رہی ہیں۔

لیجئے اب روح کو اتنی دل فریب دنیا سے الگ ہو کر اس کے مطالعہ سے وحشت پیدا ہونے لگی، اب پھر جی چاہتا ہے کہ اس دنیا میں آجائے۔ اب شخصی، اجتماعی، بین الاقوامی اور مذہبی مسائل جو الجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے زیادہ صاف، صریح اور آسان معلوم ہونے لگے۔

احمد ندیم قاسمی کی معرکہ آرا تصنیف

گرداب

یہاں کے مسائل الگ تھے۔ ماحول الگ تھا۔ لوگوں کی ذہنیتیں الگ تھیں۔ پتلونوں کی جمی ہوئی لکیروں اور بالوں کی متناسب لہروں کے تذکرے تھے۔ تصنع تھا۔ تکلف تھا۔ ریاکاری تھی۔ اور ان کے ساتھ ساتھ علم و فن کے چرچے تھے۔ یہاں نت نئی سازشوں کے راز فاش ہو رہے تھے۔ مصفا چہروں کے پیچھے سماج کا پلیگ تعفن پھیلا رہا تھا۔ اور لباسِ حریر کے نیچے زخمی روحیں بلک رہی تھیں!

لیکن بہرحال یہاں بھی انسان ہی بستے تھے۔ میں نے جو کچھ سنا اور جو کچھ محسوس کیا وہ کہانیوں کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔ میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ کہ یہاں رستے ہوئے ناسوروں پر بھی غازے کی تہیں چپکا دی جاتی ہیں تاکہ فیشن کے مذہب کا پورا پورا احترام ہو سکے! 952

ملنے کے پتے:
ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن
سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔